معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے — فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۸ ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۶ء عدد ۳

فہرست مضامین

شذرات

ملک کے مشہور فاضل ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم نے لکھا ہے "بیسویں صدی کے نصفِ اول میں جن مسلمانوں کو لوحِ تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا، ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور ملمع کی بھی تھیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں ملمع کا مال کھرے مال سے کہیں زیادہ مقبول ہوا۔ اس لئے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان جان دیتے ہیں زیادہ تھی۔" زوال پذیر قوموں کا خاصہ یہی ہے کہ ان کو حق و باطل اور صحیح و غلط میں التباس ہو جاتا ہے، وہ سود و زیاں میں فرق اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتی ہیں اور ہر چمک دار چیز انہیں زرِ خالص نظر آنے لگتی ہے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کی بے توفیقی و بے بصیرتی اور بڑھ گئی ہے اور جب تک ان کی ناسمجھی اور غلط روی کے خوف ناک نتائج بالکل آنکھوں کے سامنے نہیں آجاتے، اس وقت تک انہیں اپنے زیاں و زبوں کاری کا احساس نہیں ہوتا۔ اگر عام لوگوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے تو مسلمانوں کا کمزور تر ہوگیا ہے۔ وہ اپنی تباہی و بربادی اور اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی کو بڑی جلدی بھول جاتے ہیں۔ ماضی سے سبق لینے کے بجائے پچھلی غلطیوں کا برابر اعادہ کرتے رہتے ہیں۔

اس کی وضاحت کے لئے کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔ آزادی کے بعد ہی سے مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اور ان کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا ہے اس کے نتیجہ میں وہ عملاً دوسرے درجہ کے شہری ہوگئے ہیں اور ان کے ساتھ کھلم کھلا دوہرا معیار برتا جارہا ہے۔ اس وقت ۲/ جون ۹۵ء کو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ہونے والے واقعات کی تحقیقاتی رپورٹ پر شور قیامت برپا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں سکھوں کے قتل عام کے مجرموں کو اب ۱۹۹۶ء میں سزا ہوئی ہے۔ لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں کا قتل عام کب کب اور کہاں کہاں ہوا؟ یہ حد و شمار سے باہر ہے۔ بھاگل پور، میرٹھ، ملیانہ، ہاشم پورہ، بمبئی، سورت، بھوپال اور کان پور کے خوں چکاں اور وحشیانہ واقعات زیادہ پرانے نہیں ہیں۔ ان کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر کیا ان واقعات کی تفتیش کرائی گئی اور جن کی تفتیش کرائی گئی ان کی رپورٹ کا کیا حشر ہوا۔ خونِ مسلم کی یہ ارزانی کہ ایک قاتل و مجرم بھی سزایاب نہ ہو۔ مسلمانوں کے دوسرے درجہ کے شہری اور ان کے ساتھ دوہرے معیار ہی کا تو نتیجہ ہے۔

اس وقت بے اختیار ہم کو بابری مسجد بھی یاد آرہی ہے جس کو چار برس پہلے دن دھاڑے "اصلی سیکولرازم" کو ماننے والی جماعت کے سربراہوں کی موجودگی میں غنڈوں اور جرائم پیشہ لوگوں

نے ڈھا دیا تھا اور انہوں نے بہ بانگ دہل اس کا اعتراف اور اعلان کر کے اس پر اظہار فخر و مسرت بھی کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا صدیوں پرانی مسجد ڈھانے والے کسی بھی شخص کو قرار واقعی سزا ملی، اور غنڈہ گردی اور شر و فساد پر آمادہ، عدالتوں کی توہین کے مرتکب اور جھوٹے حلف نامے داخل کرنے والوں کے خلاف کوئی تحقیقاتی کمیشن بیٹھا۔ چیف الکشن کمشنر کی انصاف پسندی کا غلغلہ مچا ہوا ہے۔ کیا انہوں نے ملک کی عزت کو خاک میں ملا دینے اور اسے دنیا بھر میں ذلیل و رسوا کرنے والوں کو انتخابات کے لئے نااہل قرار دیا، بابری مسجد ڈھانے والے انتخابی دنگل میں اترے ہیں اور اس شان سے اترے ہیں کہ وہ حکومت بنائیں گے۔ عدالت کی توہین کرنے اور جھوٹا حلف لینے والا شخص ہی ملک کی سب سے بڑی ریاست کے سب سے بڑے بااختیار عہدے کا خواہاں ہے ع وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ان شرمناک واقعات کے اصلی ذمہ دار ہیں اور جنہوں نے ایسے عظیم الشان واقعہ پر سانس اور ڈکار تک نہیں لی، صرف مگرمچھ کے آنسو بہا دینا اور یہ کہہ دینا کافی سمجھا کہ "ہم کو دھوکا ہوگیا" اب یہ دوسروں کا سہارا لے کرنئے بھیس میں نمودار ہوئے ہیں۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں — اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

یہ سارے نقصان بھگتنے کے باوجود مسلمان دوست و دشمن اور کھرے کھوٹے میں تمیز نہیں کر پا رہے ہیں اور اپنے ذہنی افلاس کی وجہ سے شیو سینا اور بی۔ جے۔ پی سے پینگیں بڑھانا چاہتے ہیں جنہوں نے سب کی ناک میں دم کر رکھا ہے ؎

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا — میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو

مسلمانوں کے بعض نام نہاد لیڈر بی۔ جے۔ پی کی کامیابی کو یقینی سمجھ کر اترپردیش کے انتخابات میں اس کی حمایت کے لئے بال و پر تول رہے ہیں اور اس کے لئے اپنے کو جھوٹی تسلی دیتے ہوئے انہوں نے اس کے سامنے کچھ شرائط اور مطالبے بھی رکھے ہیں ع خاطر خود را تسلی می کنم۔ یہ شرائط اگر معقول بھی ہوں اور سردست بی۔ جے۔ پی انہیں منظور بھی کرلے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس جیسی فسطائی جماعت جو اپنے قول و عمل کے تضاد کے لئے مشہور اور حلف لے کر بھی مکر جانا جس کا شیوہ بن گیا ہو، آئندہ اپنے عہد پر قائم رہے گی۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کو سیکولر جماعتوں سے بھی اس قسم کے تجربوں میں سخت ناکامی ہو چکی ہے۔ اب رہی شیو سینا تو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ اس کے سربراہ بال ٹھاکرے بابری مسجد کے انہدام کو اپنا کارنامہ قرار دے کر اس پر فخر کر چکے ہیں اور بمبئی کی قیامت صغریٰ انہی کے ناز و ادا کا ایک کرشمہ تھا، لیکن اب اتفاق سے

ان کی زبان سے جو یہ نکل گیا ہے کہ "وہ ملائم سنگھ سے زیادہ مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں" تو بعض مسلمان اس پر سر دھن رہے ہیں اور افسوس کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے ابھی تک ان کو صحیح طور پر نہیں پہچانا ہے۔ یہ ہے مسلمانوں کی کھرے کھوٹے کی تمیز اور دوست و دشمن کی پہچان کہ

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

یہ صحیح ہے کہ اس وقت اتر پردیش کے حالات بہت پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ پیچیدگی بھی انہی لوگوں کی دین ہے جن کے زخم خوردہ ہوکر بھی مسلمان ان سے دوستی کی پینگ بڑھانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عیاری سے سیکولر جماعتوں میں شدید افتراق پیدا کر کے ان کے ووٹوں کو تقسیم کر دیا ہے جس سے بظاہر ان کی کامیابی یقینی ہوگئی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ سیکولر جماعتوں کو ملک و قوم سے زیادہ اپنا مفاد و اقتدار عزیز ہے۔ اسی لئے ان کو ملانے کی ساری کوششیں رائگاں گئیں ان میں کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ان کی ضد و انانیت نے بی۔ جے۔ پی کی راہ آسان کر دی ہے۔ اب ان متحارب گروہوں کا اصل مقصد بی۔ جے۔ پی کو شکست دینے کے بجائے ایک دوسرے کو شکست دینا ہوگیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ دونوں بھروسے کے لائق اور تائید و ہمدردی کے مستحق نہیں تھے۔ مگر حالات کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان جذبات کے تابع ہوکر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ انہوں نے تو خود ہی اپنی ناسمجھی اور بے راہ روی سے سارے راستے بند کر لئے ہیں اس لئے انہیں بے تعلق نہ رہ کر ان میں سے کسی کے ساتھ ہونا ہے۔ اگر ان کے ووٹ تقسیم نہیں ہوئے تو پانسہ پلٹ سکتا ہے کیونکہ اس وقت کامیابی کا انحصار بہت کچھ انہی کے ووٹوں پر ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے وقت اپنے ذاتی رجحان و میلان اور معمولی اور حقیر فائدوں کے بجائے قوم و ملک کے وسیع تر مفاد کو سامنے رکھنا ہوگا اور دونوں کے پچھلے ریکارڈ اور اس بات کو خاص طور پر دیکھنا ہوگا کہ اس نازک موڑ پر کس کا سخت موقف اتحاد و اتفاق کی راہ میں حائل ہوا ہے۔ مسلمانوں کا اصل مقصد فرقہ پرستوں کو شکست دینا ہے اس لئے عین ممکن ہے کہ بعض بعض حلقہ انتخاب میں کوئی خاص امیدوار ہی ان کو شکست دے سکتا ہو۔ ایسی صورت میں پارٹی سے بالاتر ہوکر اس کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو بڑی دور اندیشی، بیدار مغزی اور ہوش و تدبر سے کام لینا اور کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ ان کے انتشار سے فرقہ پرستوں کو فائدہ پہنچے گا اور خود ان کے حصے میں پشیمانی اور پریشانی آئے گی۔

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ میں علامہ سید سلیمان ندوی پر دسمبر ۱۹۹۶ء میں ایک سیمینار ہورہا ہے جس میں ملک و بیرون ملک کے فضلاء کی شرکت متوقع ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دارالمصنفین کو اس میں سبقت کرنی چاہئے تھی، مگر وہ تو ابھی تک علامہ شبلی پر بھی کوئی سیمینار نہیں کرسکا، جو بہر حال پیش نظر ہے۔

مقالات

علمائے اصول اور حدیث کے اقسام

از ڈاکٹر محمد باقر خاں خاکوانی۔ ملتان

قرآن مجید کی طرح اسلامی فقہ کا ایک بنیادی ماخذ سنت نبوی بھی ہے۔ ابتدا ہی سے مسلمانوں کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول، فعل یا تقریر صحیح سند سے ہم تک پہنچے اور اس سے آپ کا مقصد شرعی حکم بیان کرنا ہو اسے سنت کہا جائے گا اور یہ فقہ اسلامی کے ماخذ میں سے دوسرا ماخذ ہے[۱]۔ صحابہ کرام کے درمیان سنت کی حجیت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہوا اور اگر ان کے دور میں کسی کو اس پر کوئی اعتراض ہوتا تو وہ اس کو سختی سے تنبیہ کرتے مثلاً عمران بن حصینؓ نے اس شخص کو جس نے ہر حکم کی قرآن سے دلیل مانگی کہا کہ تم احمق آدمی ہو کیا تم قرآن میں یہ پاتے ہو کہ ظہر کی چار رکعت ہیں اور ان میں قرأت بالجہر نہیں کی جائے گی۔ انہوں نے پھر نمازوں کی تعداد اور زکوٰۃ کی مقدار بیان کر کے پوچھا کہ کیا تو قرآن میں ان احکام کی تفصیل پاتا ہے۔ قرآن نے ان احکام کو مبہم بیان کیا ہے اور سنت نے ان کو واضح کیا ہے[۲]۔ اسی لیے امام اوزاعی فرماتے ہیں:

الکتاب احوج الی السنۃ — قرآن مجید سے سنت کی احتیاج سے
من السنۃ الی الکتاب[۳] — زیادہ قرآن کو (اپنی تفسیر و تشریح کیلئے)

سنت کا احتیاج ہے۔

صحابۂ کرام کے بعد سے آج تک جمہور علما ہر دور میں حجیت سنت کے قائل رہے ہیں اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل کا استنباط اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے رہے ہیں اور آج تک کر رہے ہیں۔

دور صحابہ میں حدیث کی اقسام کا ذکر نہیں ملتا تاہم روایت کی صحت اور راوی کی ثقاہت پر اطمینان کر لینے کے بعد صحابۂ کرام حدیث قبول کرتے تھے ورنہ اسے رد کر دیتے تھے، یہی صورت حال ہمیں دور تابعین میں بھی ملتی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فقہ کی تدوین حدیث کی تدوین سے قبل پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، امام محمد بن الحسن الشیبانی کی چھ مشہور کتب جنھیں ظاہر الروایہ کا نام دیا جاتا ہے اور امام شافعیؒ کی کتاب الام وکتاب الرسالہ اور اس طرح کی کئی اور کتب فہرست ابن ندیم کے مطابق کتب احادیث سے بہت پہلے مدون ہو چکی تھیں[۴]۔

کتب فقہ کے پہلے مدون ہونے کی وجہ یہ تھی کہ عدالتی نظام کے بغیر کسی نظام یا حکومت کا چلنا دشوار ہوتا ہے اس لیے خلفائے راشدین کے ابتدائی دور سے ہی مختلف مقامات پر فقہی مدارس کھل چکے تھے جن میں فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی، بعد میں یہی مدارس تدریجاً فقہی مکاتب فکر اور آراء کی تدریس کے ادارہ بن گئے۔ ان مدارس میں فقہ کے علاوہ حدیث کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور یہیں سے اسلامی حکومت کے لیے قاضی اور مفتی مہیا کیے جاتے لیکن عالم اسلام میں چھٹی صدی ہجری سے قبل حدیث کی تدریس کے لیے جداگانہ مدرسہ موجود نہیں تھا۔ سلطان نور الدین

زنگی کے حکم سے ۵۶۹ھ میں دمشق میں سب سے پہلا دار الحدیث مدرسہ نوریہ قائم ہوا اور بعد میں پھر یہ سلسلہ چلا اور مختلف ممالک میں عام ہوا[۵]۔

دوسری صدی ہجری کے آخر تک ایک عالم بیک وقت قرآن، حدیث اور فقہ تینوں علوم کا عالم ہوتا تھا۔ اس لیے فقہا جب حدیث سے احکام کا استنباط کرتے تو اس باب میں بہت احتیاط برتتے۔ انھوں نے سنت کو قبول کرنے کے لیے بھی کچھ اصول مقرر کیے تھے، امام ابو حنیفہؒ نے بھی روایت حدیث کے بے شمار اصول وضع کیے، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ:

انما قلت روایتہ لما شدد فی شروط الروایۃ والتحمل[۶]

امام ابو حنیفہ سے روایات کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اخذ حدیث کی شروط میں سختی کی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی طرح امام شافعیؒ نے بھی صحت حدیث کو جانچنے کے لیے بے شمار اصول وضع کیے اور صحت و ضعف کے لحاظ سے اس کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جو آج بھی ان کی کتاب میں موجود ہیں[۷]۔

تیسری صدی ہجری میں جب محدثین نے علم حدیث کو ایک علحدہ اور جداگانہ علم کی حیثیت سے روشناس کرایا تو انھوں نے بھی حدیث کی صحت کو جانچنے کے طریقے، راوی کے شرائط اور حدیث کی مختلف اقسام بیان کیں۔ حدیث کے ضمن میں علمائے اصول اور محدثین کا ابتدائی کام حدیث کو جانچنا اور ان میں سے صحیح، ضعیف اور موضوع حدیثیں علحدہ کرنا ہے۔ لیکن دونوں علوم کے علمار کے درمیان کچھ اجمالی اختلافات بھی ہیں جن میں ایک اختلاف حدیث کے اقسام میں ہے۔

محدثین کے نزدیک حدیث کا موضوع سند و متن ہے اس لیے انہوں نے ان دونوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور جہاں دو حدیثوں میں راویوں کے درمیان فرق یا دو حدیثوں کے متن میں مضمون، الفاظ حتیٰ کہ نقطہ کا بھی اختلاف ظاہر ہوا تو ان کے مختلف نام رکھ دیے اس طرح محدثین نے اس علم کو عروج ثریا سے ہم کنار کیا۔ لیکن علمائے اصول کو استنباط کے طریقوں کی وضاحت کرنا تھا۔ اس لیے انہوں نے حدیث کو اپنی ضرورت کے لحاظ سے بہت کم قسموں میں تقسیم کیا اور زیادہ محنت استنباط کے طریقہ بیان کرنے پر صرف کی۔ اس لیے اصول فقہ کی تمام کتاب کے باب السنہ میں جہاں ہمیں محدثین کی بیان کردہ لاتعداد اقسام کے برعکس حدیث کی کچھ بنیادی اور چند ذیلی قسمیں ملیں گی وہاں علمائے اصول نے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ ان کی بیان کردہ حدیث کی اقسام محدثین کی اقسام سے بالکل مختلف ہیں، جیسے امام سبکیؒ فرماتے ہیں:

والمرسل عنده جمهور المحدثين هو ان يترك الراوي ذكر الواسطة بينه وبين المروي عنه مثل ان يترك التابعي ذكر الواسطة بينه وبين رسول الله صلى الله عليه وسلم كقول سعيد بن المسيب: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم" اما اذا سقط واحد قبل التابعي فيسمى منقطعاً وان سقط اكثر سمي معضلاً وعند الاصوليين المرسل قول من لم يلتق النبي صلى الله عليه وسلم سواء كان تابعيا ام من تابع التابعين والى يومنا هذا فتفسير الاصوليين اعم من تفسير المحدثين [۸]

مرسل جمہور محدثین کے نزدیک ایسی حدیث ہے جس میں راوی وہ واسطہ جس سے اس نے حدیث سنی ہے ساقط کر دے، جیسے کوئی تابعی مثلاً سعید بن المسیب کہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور اگر کوئی راوی تابعی سے پہلے ساقط ہوتا ہے تو وہ حدیث منقطع ہے اور اگر راوی ایک سے زیادہ ساقط ہیں تو وہ معضل ہے لیکن علمائے اصول کے نزدیک ہر وہ حدیث جس کی سند رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچے مرسل ہے چاہے اس کی سند میں تابعی ساقط ہو یا تبع تابعی وغیرہ۔ مرسل کی جو تعریف علمائے اصول نے کی ہے وہ محدثین کی تعریف سے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علمائے اصول کے نزدیک اقسام حدیث اور محدثین کی اقسام میں کافی فرق ہے۔ اسی موقف کو مشہور حنفی اصولی ملا جیون اس طرح بیان کرتے ہیں:

والسنة اربعة اقسام الى اربعة تقسيمات وتحت كل تقسيم اقسام متعددة وهذا على طبق اصول الفقه لا اصول الحديث وان اشتركا في بعض الاسامي والقواعد [۹]

اور سنت کو چار طریقوں سے تقسیم کیا گیا ہے اور ہر قسم کی متعدد ذیلی قسمیں بھی ہیں لیکن یہ تمام تقسیم علمائے اصول کے نقطہ نظر سے ہے نہ کہ محدثین کی رائے کے مطابق۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بعض کے نام اور تعریفوں میں کہیں اتفاق ہو جائے۔

حدیث کے اقسام

علمائے اصول کے حدیث کی علیحدہ اقسام ترتیب دینے کے بارے میں خود ابن الصلاح بھی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

ومن المشهور المتواتر الذی یذکرہ اھل الفقہ واصولہ واھل الحدیث لا یذکرونہ باسمہ الخاص المشعر بمعناہ الخاص [۱۰]

اور مشہور کی ایک قسم متواتر بھی ہے جس کا فقہاء اور علمائے اصول ذکر کرتے ہیں لیکن محدثین نے نہ تو اسکی کوئی خاص نشانی یا تعریف مرتب کی ہے اور نہ ہی کوئی نام۔

لیکن علمائے اصول کے وضع کردہ اقسام کے ذکر سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کی ترتیب دادہ اقسام حدیث کا اجمالی خاکہ بھی بیان کر دیا جائے۔

محدثین نے حدیث کی تقسیم دو طریقوں سے کی ہے پہلے حدیث کی تقسیم راویوں کے لحاظ سے کی ہے اور اس کی ذیلی تقسیم میں صحیح اور ضعیف حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے۔

حدیث کی دوسری تقسیم انتہائے سند کے لحاظ سے کی ہے ان تمام اقسام کو مختصراً درج ذیل نقشہ سے واضح کیا جا رہا ہے۔

پہلی تقسیم = حدیث (تعداد راوی کے لحاظ سے)
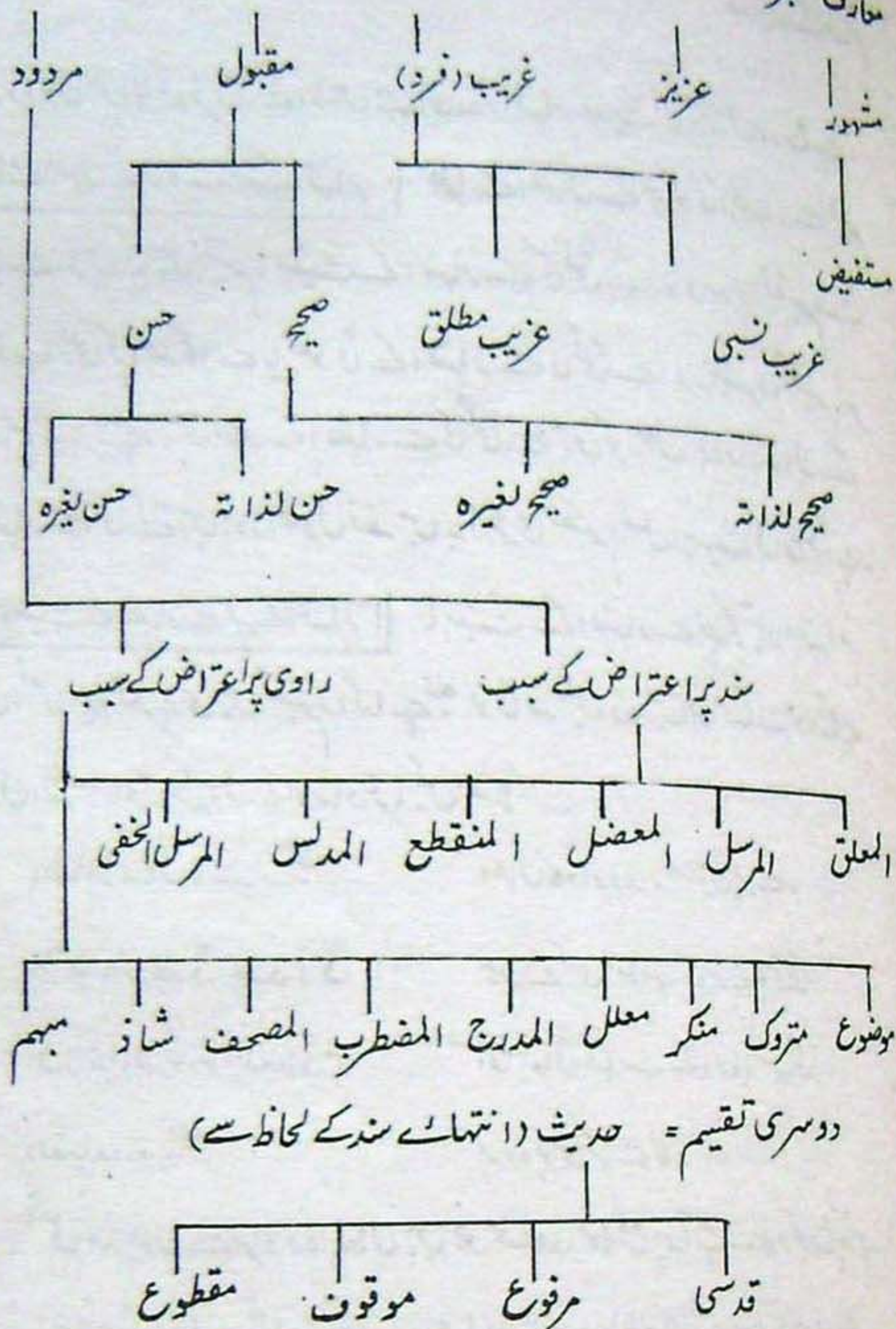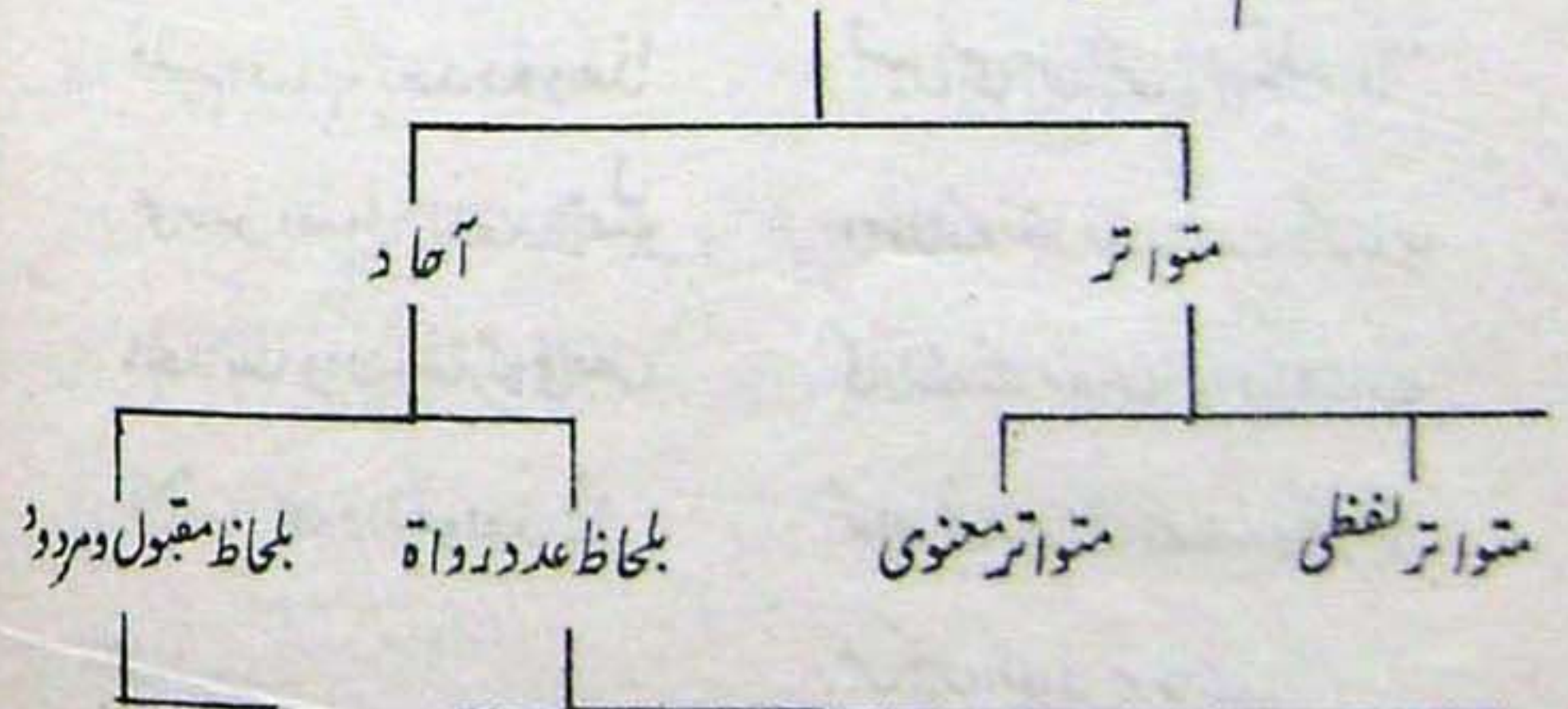
دوسری تقسیم = حدیث (انتہائے سند کے لحاظ سے)
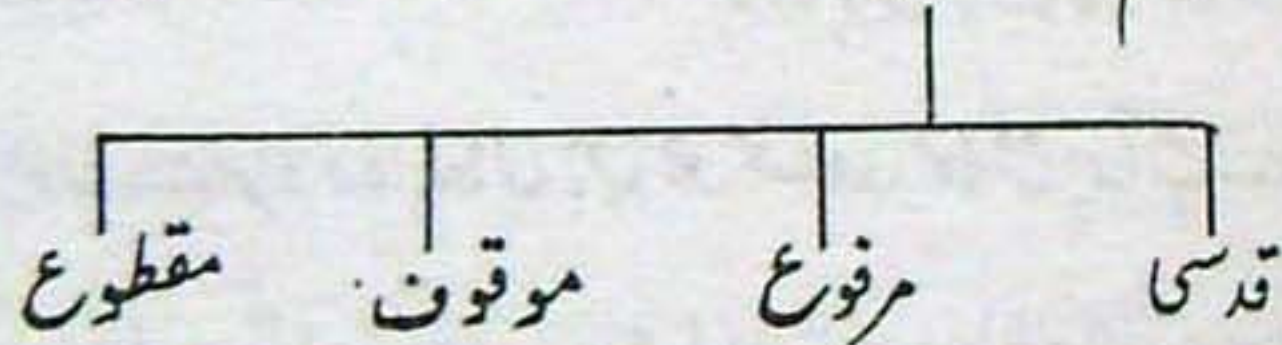
محدثین کے نزدیک اس کے علاوہ بھی حدیث کی کچھ اور اقسام ہیں لیکن وہ تقریباً انہیں اقسام کی ذیلی قسمیں ہیں [۱۱]

محدثین کی بیان کردہ ان اقسام حدیث کا جائزہ لینے کے بعد جب ہم علمائے اصول کے وضع کردہ حدیث کی اقسام کا مطالعہ کریں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی

کہ دونوں میں کافی فرق ہے، ذیل میں ان کے، اقسام حدیث کی تفصیل درج ہے۔

علمائے اصول کے نزدیک خبر کے اقسام | علمائے اصول نے خبر کو کئی اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ اس کی پہلی تقسیم ماہیئت کے اعتبار سے کی گئی ہے، دوسری تقسیم صدق وکذب، یعنی کیا خبر سچی ہے یا جھوٹی کے اعتبار سے کی گئی ہے اور تیسری تقسیم خبر کے ہم تک پہنچنے یعنی سند کے اعتبار سے کی گئی ہے جس کو بعض علماء اتصال کے اعتبار سے بھی کہتے ہیں اور اصول فقہ میں یہ آخری تقسیم اصل اہمیت کی حامل ہے۔

۱۔ ماہیت کے اعتبار سے خبر کے اقسام | ماہیئت کے اعتبار سے خبر کو تین اقسام قولی، فعلی اور تقریری میں تقسیم کیا گیا ہے[12] قولی حدیثیں وہ ہیں جو مختلف مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں، مثلاً

انما الاعمال بالنیات[13]	اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔
لا یستر عبدٌ عبداً فی	جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی
الدنیا الا ستر اللہ یوم	اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی
القیامہ۔[14]	پردہ پوشی کرے گا۔

فعلی حدیثوں سے مراد وہ افعال ہیں جو مختلف مواقع پر آپ سے وقوع پذیر ہوئے۔ مثلاً وضو، نماز، حج اور دوسرے عبادات و معاملات کے سرانجام دینے کا طریقہ جن کے بارے میں آپ نے فرمایا:

خذوا عنی مناسککم[15]	مجھ سے اپنے عبادات کے طریقے سیکھو
صلوا کما رأیتمونی اصلی[16]	نماز اس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز
	پڑھتا دیکھتے ہو۔

تقریری سے مراد یہ ہے کہ آپ کے سامنے کسی نے کوئی کام کیا، یا آپ کو اسکی اطلاع دی گئی ہو اور آپ نے اس کو نہ روکا ہو اس کے پھر دو اقسام ہیں۔

۱۔ آپ نے اس عمل پر کوئی اچھا یا برا ردعمل ظاہر نہ کیا ہو اور صرف سکوت فرمایا ہو۔

۲۔ آپ نے سکوت کے ساتھ خوشی کا اظہار بھی فرمایا ہو۔

پہلی قسم کی مثال یہ حدیث ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک
علیہ وسلم مر بامرأۃ تبکی	مرتبہ ایک عورت کے پاس سے گزرے
عند قبر فقال لہا اتقی	اور وہ قبر پر بیٹھی رو رہی تھی
اللہ واصبری فقالت امرأۃ	تو آپ نے اس سے کہا کہ اللہ سے
الیک عنی فانک لم تصب	ڈرو اور صبر کرو۔ اس نے جواب دیا
بمصیبتی ولم تعرفہ۔	آپ کو میری مصیبت کا کیا احساس
فقیل لہا انہ النبی صلی اللہ	اور وہ آپ کو نہ جانتی تھی، اس سے
علیہ وسلم فذھب	کہا گیا کہ یہ تو اللہ کے رسول ہیں تو وہ
الی بیتہ ... الحدیث[17]	آپ کے گھر معذرت کے لیے آئی۔

اس حدیث سے عورتوں کے لیے زیارت قبور کا جواز ملتا ہے۔

دوسری قسم کی مثال وہ حدیث ہے جس میں حضرت زید بن حارثہ کے سفید رنگ اور ان کے فرزند حضرت اسامہ کے سانولے رنگ کے وجہ سے اکثر منافقین حضرت زید کو طعنہ دیتے تھے کہ یہ بیٹا تمہارا نہیں لگتا۔ ایک دن دونوں باپ بیٹا

مسجد نبوی میں اکٹھے سوئے ہوئے تھے اور دونوں کے پاؤں چادر سے باہر نکلے ہوئے
تھے، اس موقع پر ایک ماہر انساب بھی موجود تھا اس نے جب دونوں کی ٹانگوں کو
دیکھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ کہا:

ھذہ الاقدام بعضھا من	یہ ٹانگیں تو ایک دوسرے کے
بعض فظھر السرور علی النبی	مشابہ ہیں تو قیافہ شناس کے اس
صلی اللہ علیہ وسلم بقول	قول سے آپ کے چہرے پر خوشی کے
القائف[18]	آثار نمایاں ہوئے۔

اور یہ اظہار مسرت آپ کی طرف سے اس بات کا اظہار تھا کہ قیافہ بھی نسب
کے ثابت کرنے کا ایک ذریعہ ہے[19]

ب۔ صدق وکذب کے اعتبار سے خبر کے اقسام | صدق وکذب کے اعتبار سے
علمائے اصول نے خبر کے تین اقسام بیان کیے ہیں:

۱۔ خبر قطعی طور پر سچی ہوگی۔

۲۔ خبر قطعی طور پر جھوٹی ہوگی۔

۳۔ خبر کے سچ وجھوٹ ہونے کے بارے میں کوئی علم نہ ہو۔[20]

۱۔ خبر کے قطعی طور پر سچے ہونے کا ایک طریقہ تواتر ہے، تواتر سے مراد
ایسی خبر ہے جس کو ایک ایسا کثیر گروہ روایت کرے جس کا جھوٹ پر مخفی طور پر
اتفاق کر لینا محال ہو، تواتر کے علاوہ بھی خبر کے قطعی طور پر سچے ہونے کا ایک اور
طریقہ ہے اور اس طریقہ سے درج ذیل چھ قسم کی خبریں سچی قرار دی جاتی ہیں۔

۱۔ خبر کی صداقت تسلیم کرنے پر انسان مجبور ہو مثلاً ایک دو کا نصف ہے،

اس کو اصطلاح میں "بالضرورة" کہتے ہیں۔
دنیا فانی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی خبر، یعنی جو خبر اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک بھیجی مگر اس میں
اختلاف ہے کہ اس کی دلیل عقلی ہے یا نقلی، امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس پر عقل
و نقل دونوں دلالت کرتے ہیں۔ نقلی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بتانا ہے
کہ اللہ تعالیٰ سے جھوٹ کا صدور ممکن نہیں اور عقلی دلیل یہ ہے کہ اس کا کلام
بذاتہ قائم ہے[21]

۳۔ خبر کا اظہار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو۔

۴۔ خبر کا اظہار ساری امت کرے کیونکہ اجماع امت حجت ہے۔

۵۔ کثیر گروہ کا اپنے طبعی حالات مثلاً بھوک، پیاس، نفرت، محبت کی
خبر دینا کیونکہ ان تمام کا اس قسم کی خبر میں جھوٹ پر اتفاق محال ہے۔

۶۔ ایسی خبر جس کی قرائن شہادت دیں، مثلاً کسی کو خبر ملے کہ بادشاہ کا
بیٹا فوت ہو گیا ہے جب کہ بادشاہ کے گھر میں مریض صرف اس کا بیٹا تھا، پھر مرد
اور عورتیں اس کے گھر سے غم زدہ نکل رہے ہوں، مزید یہ کہ بادشاہ خود بھی جنازہ
کے پیچھے غم زدہ حالت میں چل رہا ہو تو ایسی خبر کی سچائی بھی قطعی ہوگی اور یہ
رائے غزالی، جوینی اور نظام کی ہے[22]

۲۔ وہ خبر جس کا جھوٹا ہونا قطعی ہے اس کی چار اقسام ہیں۔

۱۔ جس کا جھوٹا ہونا ضرورتاً یا استدلالاً معلوم ہو مثلاً پانچ جمع دو مساوی
ہے چھ، یا یہ کہنا کہ انسان تو کبھی مرتا ہی نہیں، آگ ٹھنڈی ہے یا عالم قدیم ہے وغیرہ

۲۔ ایسی خبر جو تواتر کے ساتھ نقل کرنے کے قابل ہو مگر اسے تواتر سے نقل نہ

کیاجائے۔ مثلاً جامع مسجد میں امام کے جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے منبر سے گرنے کی خبر صرف ایک شخص دے حالانکہ اس وقت ہزاروں آدمیوں نے اس واقعہ کو دیکھا ہو۔

۳۔ جو چیزیں منقول ملیں مگر جب ان کی تحقیق کی جائے، تو وہ کسی کتاب یا راویوں کے ذہنوں میں نہ ملیں۔

۴۔ کسی ایک آدمی کی خبر جس کے جھوٹ میں کوئی شک نہ ہو۔

۳۔ اور ایسی خبر جس کی سچائی اور جھوٹ کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے وہ خبر واحد ہے۔[۲۳]

ج۔ سند کے اعتبار سے خبر کی اقسام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنت ہیں براہ راست نہیں پہنچی بلکہ راویوں نے ایک دوسرے سے روایت کرکے اسے ہم تک پہنچایا ہے۔ راویوں کے اس سلسلہ کو سند کہتے ہیں۔ سند کے اتصال کے اعتبار سے خبر کی اقسام میں علمائے اصول کے مابین اختلاف ہے اور اس بارے میں تین آراء پائی جاتی ہیں۔

۱۔ جمہور کی رائے جمہور یعنی مالکی، شافعی اور حنبلی علمائے اصول بنیادی طور پر خبر کو اتصال کے اعتبار سے دو قسموں خبر متواتر اور خبر احاد میں تقسیم کرتے ہیں پھر خبر متواتر کو دو ذیلی قسموں متواتر لفظی اور متواتر معنوی اور خبر احاد کو بھی دو ذیلی قسموں خبر واحد اور خبر مشہور میں تقسیم کرتے ہیں اور خبر واحد کو بھی مزید دو ذیلی قسموں مسند اور مرسل میں تقسیم کرتے ہیں، ان کے نزدیک مرسل کا دوسرا نام منقطع بھی ہے۔[۲۴]

جمہور کے نزدیک خبر کی تقسیم کا نقشہ حسب ذیل ہے:

- خبر
  - متواتر
    - متواتر لفظی
    - متواتر معنوی
  - احاد
    - مشہور
    - واحد
      - مسند
      - مرسل (منقطع)
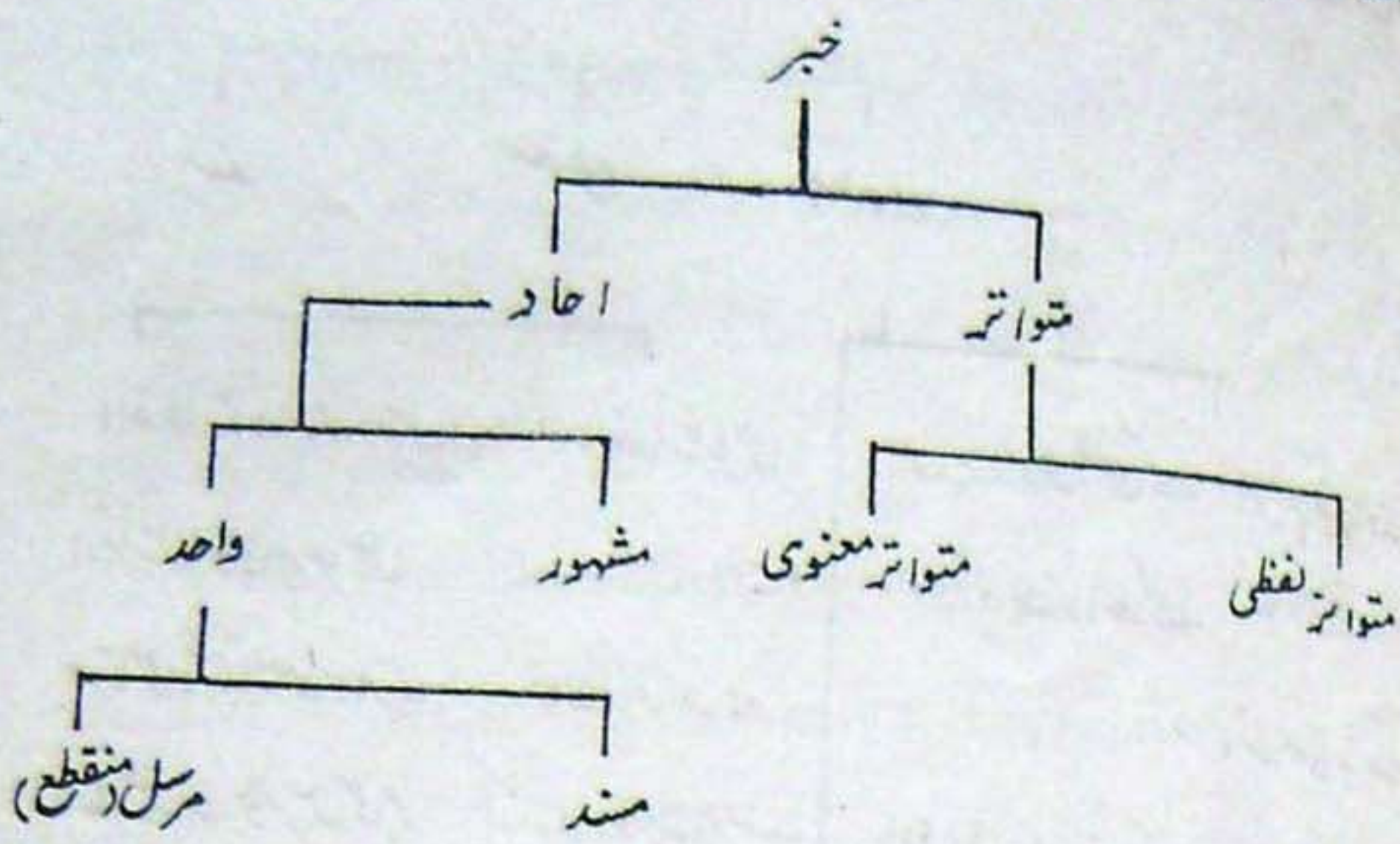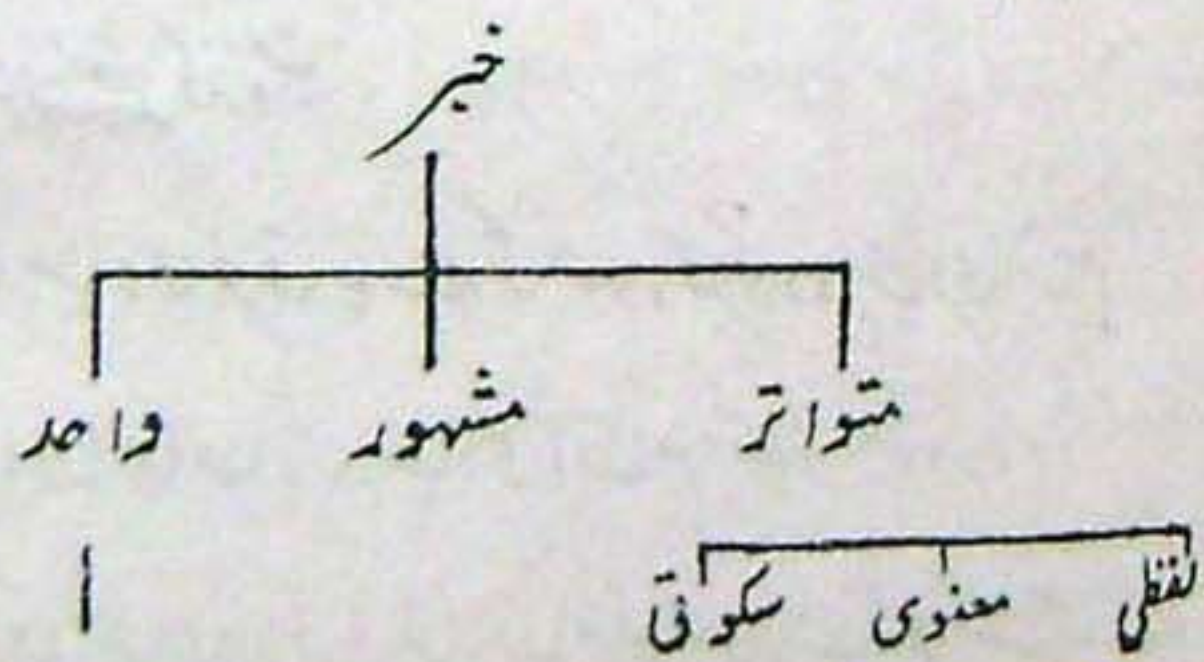
جمہور کے نزدیک خبر واحد کی کچھ مزید اقسام بھی ہیں وہ خبر واحد کے عنوان میں بیان ہوں گی۔

احناف کی رائے احناف اتصال کے اعتبار سے خبر کو بنیادی طور پر تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں، خبر متواتر، خبر مشہور اور خبر واحد پھر خبر متواتر کی ذیلی قسموں میں وہ جمہور سے کافی حد تک متفق ہیں۔[۲۵] لیکن خبر واحد کو وہ دوبارہ تین ذیلی قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مسند، منقطع اور مطعون۔ وہ بھی منقطع کو کہیں مرسل کا نام دیتے ہیں،[۲۶] ان کے نزدیک مسند کی کوئی مزید ذیلی قسم نہیں ہے لیکن وہ منقطع اور مطعون کو بہت سی قسموں میں تقسیم کرتے ہیں جس کی تفصیل درج ذیل نقشہ سے واضح ہوتی ہے۔[۲۷]
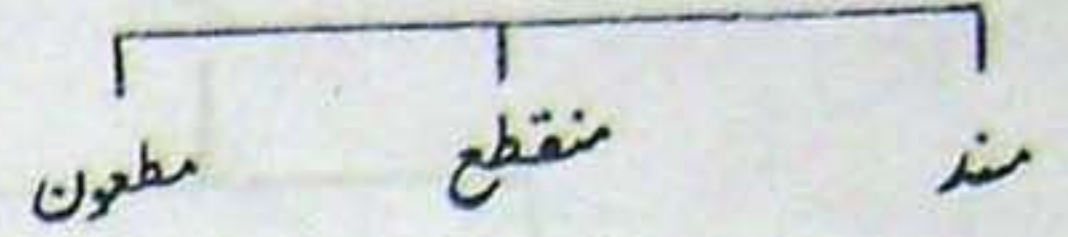
- خبر
  - متواتر
    - لفظی
    - معنوی
    - سکوتی
  - مشہور
  - واحد

- مسند
- منقطع
  - انقطاع ظاہری (مرسل)
    - ۱۔مراسیل صحابی ۲۔مراسیل تابعی و تبع تابعین ۴۔مراسیل عادلین ۵۔جو مرسل بھی ہو اور مسند بھی ہو۔
  - انقطاع باطنی
    - (الف) ۱۔ایسی روایت جو قرآن کی مخالف ہو
    - ۲۔ایسی روایت جو سنت مشہور کی مخالف ہو۔
    - ۳۔ایسی روایت جو عموم بلوی کی مخالف ہو۔
    - ۴۔ایسی روایت جس کی ائمہ صحابہ مخالفت کریں
    - ۵۔مستور الحال کی روایت
    - ۶۔فاسق کی روایت
    - ۷۔بدعتی کی روایت
    - ۸۔بچہ، مجنون، مغفل کی روایت
- مطعون
  - جس پر راوی طعن کرے
    - راوی روایت کا انکار کرے
    - راوی اپنی روایت کے خلاف عمل کرے۔
    - راوی اپنی روایت کے کسی ایک احتمال کو معین کرے۔
    - راوی حدیث پر عمل ترک کر دے۔
  - جس پر غیر راوی طعن کرے
    - ائمہ صحابہ حدیث پر اعتراض کریں۔
    - ائمہ محدثین حدیث پر اعتراض کریں۔

جمہور اور احناف کی تقسیم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جمہور خبر کو دو بنیادی اقسام متواتر اور احاد میں تقسیم کرتے ہیں اور احناف تین بنیادی اقسام متواتر، مشہور اور واحد میں تقسیم کرتے ہیں، گو احناف کی خبر واحد کی ذیلی اقسام کو جمہور نے اپنی کتب میں

ذکر کیا ہے مگر اس تفصیل اور شرح کے ساتھ نہیں کیا جیسے احناف نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔

ماوردی اور قرانی کی رائے

احناف کی طرح ابوالحسن ماوردی اور محمد بن ادریس قرانی نے بھی حدیث کو بنیادی طور پر تین قسموں میں تقسیم کیا ہے لیکن ان قسموں کے نام احناف کی قسموں کے ناموں سے مختلف ہیں۔ ماوردی کے نزدیک خبر کی تین بنیادی قسمیں ہیں، اخبار استفاضہ، اخبار تواتر اور اخبار احاد۔ ان کے نزدیک اخبار استفاضہ اور اخبار تواتر کی ذیلی اقسام نہیں۔ البتہ اخبار احاد دو ذیلی قسموں میں تقسیم ہوتی ہے، مسند اور مرسل۔[38]

قرانی کے نزدیک بھی خبر کی تین بنیادی قسمیں ہیں، خبر متواتر، خبر احاد اور ایسی خبر جو نہ متواتر ہو اور نہ احاد۔ ان کے نزدیک یہ قسم ایسی خبر واحد ہے جس کی شہادت قرائن دے رہے ہوں۔[39] ان تمام آراء کے برعکس شافعیہ میں سے امام غزالی اور ابن حزم ظاہری کے نزدیک مشہور نہ تو خبر کی کوئی قسم ہے اور نہ ہی خبر واحد کی۔[40]

علمائے اصول کے نزدیک خبر کی بیان کردہ ان تقسیمات میں سے پہلی دو تقسیموں کی تفصیل تو ساتھ درج ہے لیکن تیسری تقسیم جو سند کے اعتبار سے ہے اس کی تفصیل آیندہ سطور میں بیان کی جا رہی ہے۔ سند کے لحاظ سے خبر کی اقسام کی لغوی و اصطلاحی تعریف، ان کی شرعی حیثیت اور مختلف علمائے اصول کے ان کے بارے میں اختلاف کو اگر کماحقہ نقل کیا جائے تو ہر قسم ایک منفرد باب کی متقاضی ہے لیکن طوالت کے خوف سے ان تمام اقسام کی مختصر تشریح پر اکتفا کیا جاتا ہے، کیونکہ زیر نظر مضمون کے ذریعے اہل علم کے سامنے یہ بات رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دور حاضر کے اکثر علماء کی یہ رائے کہ فقہاء، حدیث کے میدان میں محدثین کے

ترتیب کردہ اصول روایت حدیث پر اکتفا کرتے ہیں صحیح نہیں بلکہ فقہاء نے اپنے لیے علٰحدہ اصول حدیث مرتب کیے ہیں۔

خبر متواتر لفظ متواتر کا مادہ "و تر" ہے جو لفظ "شفع" کی ضد ہے۔ قرآن مجید میں ہے "والشفع والوتر"[31] لفظ تواتر کا اصل توا تر تھا پھر واؤ سے تبدیل ہوگیا اور یہ لفظ وتر سے تفاعل کے صیغہ پر ہے، اہل لغت کے نزدیک تواتر سے مراد اشیاء کا یکے بعد دیگرے کچھ وقفہ کرکے آنا ہے۔ جیسے عربی میں ایک محاورہ ہے "جاؤا تری"، جس کے معنی وہ یکے بعد دیگرے (ایک دوسرے کے پیچھے) آئے۔[32]

اصطلاح میں خبر متواتر سے مراد ہر وہ خبر ہے جس کے راوی اتنے کثیر تعداد میں ہوں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو اور اس جماعت کی خبر سے سامع کو واقعہ کا اس طرح علم ہو جائے جیسے وہ خود آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور کانوں سے سُن رہا ہو نیز وہ اس خبر کی تصدیق کے لیے کسی اور ذریعہ کا محتاج بھی نہ ہو۔[33]

خبر متواتر میں سات شرائط ایسی ہیں جن پر تمام علمائے اصول متفق ہیں۔

۱۔ راویوں کا کثیر تعداد میں ہونا۔

۲۔ راویوں کا صاحب عقل ہونا۔

۳۔ راویوں کا خبر سے حصول علم کی خواہش رکھنا۔

۴۔ راویوں کو خبر کا یقینی علم ہونا۔

۵۔ راویوں کے حصول علم کا ذریعہ ان کے اپنے حواس ہونا۔

۶۔ راویوں کی خبر کا تصدیق کے لیے کسی اور ذریعہ کا محتاج نہ ہونا۔

۷۔ خبر کی مندرجہ بالا چھ شروط کا تمام ادوار میں باقی رہنا۔[34]

اگر کسی خبر میں یہ تمام شروط موجود ہیں تو وہ خبر متواتر ہے اور کوئی ایک شرط

بھی نہیں تو وہ خبر متواتر شمار نہیں ہوگی۔

خبر متواتر کے اقسام خبر متواتر کے اقسام میں علمائے اصول کے درمیان اختلاف ہے۔ جمہور علمائے اصول نے خبر متواتر کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، متواتر لفظی اور متواتر معنوی، لیکن بعض علماء کے نزدیک ان دو قسموں کے علاوہ ایک تیسری قسم متواتر سکوتی بھی ہے اور بعض خبر متواتر کو پہلے دو اقسام قولی اور فعلی میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر قولی خبر متواتر کی دو ذیلی اقسام لفظی اور معنوی بیان کرتے ہیں۔ ان اقسام کی تشریح مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ قولی متواتر سنت قولی متواتر سنت ایسی روایت کو کہتے ہیں جسے ایسی جماعت روایت کرے جس میں بکثرت لوگ شامل ہوں، نیز وہ خبر متواتر کی تمام شرائط پوری کرتے ہوں اور وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد مبارک (صرف قول) روایت کریں، اس کی دو قسمیں ہیں لفظی و معنوی۔[35]

الف۔ متواتر لفظی یہ ایسی سنت ہے جس کو مذکورہ جماعت سند کے اول، اوسط اور آخر میں ایک ہی قسم کے الفاظ کے ساتھ روایت کرے یعنی سنت کے الفاظ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح تواتر سے منقول ہوں کہ ہر درجہ میں ان الفاظ اور ان کی تعداد میں کوئی فرق نہ ہو۔[36] اس سنت کی مثال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مبارک ہے:

من کذب علیّ متعمداً	جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ بولے
فلیتبوأ مقعدہ من النار[37]	وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے۔

اس سنت کو ایک سو سے زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہے جن میں عشرہ

مبشرہ بھی شامل ہیں[۳۸]

ب۔ متواتر معنوی | یہ ایسی سنت ہے جس کو مذکورہ جماعت سند کے اول، اوسط
اور آخر میں معنی و مضمون کے اشتراک کے ساتھ روایت کرے یعنی راویوں کے الفاظ
ان کی روایات میں مختلف ہوں لیکن تمام روایات میں ایک ہی مضمون پایا جاتا
ہو۔ اس قسم کی خبر متواتر میں یہ بات لازم نہیں کہ ہر روایت کو بیان کرنے والے
راوی الگ الگ تواتر کی حد کو پہونچیں تاہم مفہوم متحد ہونے کی صورت میں یہ شرط
ہے کہ مجموعی روایات کے اعتبار سے وہ تواتر کی حد کو پہونچیں خواہ وہ سنت رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مواقع کے لحاظ سے روایت کی گئی ہو[۳۹] مثلاً حاتم کی سخاوت،
حضرت علیؓ کی شجاعت، حضرت عمرؓ کا عدل اور ان کی دین کے معاملے میں پختگی اور حضرت
ابوذرؓ کا زہد وغیرہ۔[۴۰]

اس قسم کی احادیث بے شمار ہیں مثلاً حدیث مسح علی الخفین، قرآن مجید کا
سات قراتوں میں اترنا، حدیث شفاعت، حدیث حوض الکوثر، قیامت کے دن
حساب کتاب کی احادیث، آخرت میں اللہ تعالی کو دیکھنے کے بارے میں احادیث،
عذاب قبر کی احادیث، نمازوں میں رکعات کی تعداد کے بارے میں احادیث رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا اصحاب کے ساتھ غزوۂ بدر اور دوسرے غزوات میں تشریف لے
جانا، کے بارے میں احادیث، اذان، اقامت کی احادیث، جماعت کی فضیلت کی
احادیث اور ایسی بے شمار احادیث متواتر کی قبیل میں سے ہیں، محدثین میں سے
ابن الصلاح کا یہ کہنا کہ حدیث متواتر صرف یہی ایک حدیث (من کذب علی
متعمداً۔ الحدیث) ہے۔ شاید اس وجہ سے ہو کہ اس سے ان کی مراد متواتر لفظی

ہو۔ ورنہ احادیث متواترہ تو بے شمار ہیں[۴۱]

مزید برآں جلال الدین سیوطی نے تمام متواتر احادیث کو اپنی ایک کتاب میں اکٹھا
کیا ہے اور اس کا نام "الازہار المتناثرة فی الاخبار المتواترة" رکھا اور اس کا
خلاصہ اپنی ایک اور کتاب قطف الازہار میں کیا اور احادیث متواترہ پہ ایک
اور کتاب محمد بن جعفر الکتانی نے بھی "نظم المتناثر من الحدیث المتواتر" کے
نام سے لکھی ہے۔

ج۔ فعلی متواتر سنت | یہ وہ سنت ہے جس میں ایک جم غفیر خبر متواتر کی تمام شرائط
پوری کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل روایت کرے مثلاً حدیث
"رفع الیدین فی الدعا" یعنی دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کی حدیث وغیرہ[۴۲]

متواتر سکوتی | اس سے مراد ایسی سنت ہے جو ایک جماعت میں سے صرف ایک آدمی
روایت کرے اور باقی تمام خاموش رہیں، مگر ان کے تیور سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ
اس خبر کو جھوٹ نہیں جانتے اگر جھوٹ جانتے تو فوراً تردید کر دیتے[۴۳] مثلاً حدیث
"انما الاعمال بالنیات"[۴۴] اس حدیث کو حضرت عمرؓ نے مسجد نبویؐ میں تمام اصحاب
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا مگر کسی ایک صحابی نے بھی اس کا انکار کیا
اور نہ ہی ان کو ٹوکا۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کے دور میں صحابہ کا یہ طریقہ تھا کہ اگر
امیر تھوڑی سی غلطی بھی کرتا تو اسے ٹوک دیتے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
اس حدیث پر تمام صحابہ متفق تھے۔ اس وجہ سے یہ حدیث بھی متواتر ہوئی مگر
سامعین کے اس پر سکوتی تائید کی وجہ سے اس کو متواتر سکوتی کا نام دیا
جائے گا[۴۵]

(باقی)

حوالہ جات

[1] عبدالوہاب خلاف۔ علم اصول الفقہ۔ کویت دارالفکر ۱۹۷۸ء، ص ۳۶ نیز ملاحظہ فرمائیں، ابوزہرہ۔ اصول الفقہ۔ بیروت، دارالفکر عربی سن اشاعت درج نہیں ہے ص ۱۰۱ [2] شاطبی ابواسحاق۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ۔ مصر۔ المکتبۃ التجاریہ الکبری، سن اشاعت درج نہیں ہے، ج ۴، ص ۲۶ [3] ایضاً [4] دیکھئے تدریب الراوی کا مقدمہ از عبدالوہاب عبداللطیف استاذ جامعہ ازہر، لاہور، دارنشر الکتب الاسلامیہ سن اشاعت درج نہیں ہے۔ ج ۱، ص ۳ [5] مسلم بن حجاج۔ صحیح مسلم۔ بیروت۔ دار احیاء التراث الاسلامی ۱۹۵۴ء، مقدمہ، ج ۱، ص ۱۳ [6] علی ابن ندیم محمد بن اسحاق۔ الفہرست ابن ندیم۔ مصر۔ مطبعہ رحمانیہ۔ سن اشاعت درج نہیں ہے، ص ۲۸۶ نیز ملاحظہ فرمائیں، علی حسن عبدالقادر۔ نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی۔ مصر، مطبعہ العلوم، ۱۹۴۲ء ص ۱۱۴ [7] صبحی صالح۔ علوم الحدیث و مصطلحہ۔ بیروت۔ دارالعلم للملایین ۱۹۶۵ء، ص ۷۵ [8] ابن خلدون عبدالرحمٰن بن محمد۔ مقدمہ ابن خلدون، لبنان۔ موسستہ العلمی، سن اشاعت درج نہیں ہے۔ ص ۴۴۵، نیز ملاحظہ فرمائیں، ابن کثیر عماد الدین۔ الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث۔ قاہرہ۔ مکتبہ دارالتراث ۱۳۹۹ھ ص ۱۱۷ [9] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں، امام شافعی۔ کتاب الرسالہ، ص ۳۷۰-۳۷۱ [10] السبکی علی بن عبدالکافی۔ الابہاج فی شرح المنہاج۔ بیروت، دارالکتب العلمیہ ۱۹۸۴ء ج ۲ ص ۳۳۹ نیز ملاحظہ فرمائیں، باجی ابوالولید المالکی الاشارہ فی اصول الفقہ۔ تحقیق طفیل قریشی، اسلام آباد، معہد الدراسات الاسلامیہ ۱۹۸۱ء، ص ۴۱۔ حقانی عبدالحق۔ الحسامی شرح النامی ۔ دیوبند کتب خانہ رحیمیہ۔

سن اشاعت نہیں ہے، ج ۱ ص ۱۳۶ [11] ملاجیون حافظ شیخ احمد۔ شرح نورالانوار علی المنار۔ بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۷ھ، ج ۲، ص ۴۔ نیز ملاحظہ فرمائیں، عبدالعلی بحرالعلوم فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت۔ قم۔ منشورات الرضی۔ سن اشاعت نہیں ہے، ج ۲، ص ۱۱۱ [12] الشہرزوری ابن الصلاح عثمان بن عبدالرحمٰن، مقدمہ ابن الصلاح ملتان فاروقی کتب خانہ، سن اشاعت نہیں ہے، ص ۱۳۵ [13] محمود الطحان۔ تیسیر مصطلح الحدیث۔ لاہور، دارالنشر الکتب الاسلامیہ، سن اشاعت نہیں ہے، خلاصہ ص ۱۸-۱۲۵ [14] عبدالعلی۔ فواتح الرحموت۔ محولہ بالا ایڈیشن، ج ۲، ص ۹۷ [15] امام بخاری صحیح بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب ماجاء انما الاعمال بالنیہ [16] امام مسلم۔ صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلہ والآداب، باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ عیبہ فی الدنیا [17] امام احمد بن حنبل۔ مسند احمد بن حنبل۔ بیروت۔ المکتب الاسلامی، سن اشاعت نہیں ہے ج ۴، ص ۱۳۸، ۳۳۷ (حدیث جابر بن عبداللہ) [18] امام بخاری۔ صحیح بخاری۔ کتاب الاذان۔ باب اذان المسافر اذا کانوا جماعۃ [19] امام بخاری۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ باب زیارۃ القبور وقول الرجل للمرأۃ عند القبر اصبری [20] امام بخاری صحیح بخاری۔ کتاب فضائل ثلاثہ۔ باب مناقب زید بن حارثہ [21] ذکی الدین شعبان اصول الفقہ الاسلامی۔ لبنان۔ مطابع دارالکتاب ۱۹۷۱ء، ص ۵۶ [22] سیف الدین آمدی۔ الأحکام فی اصول الاحکام۔ قاہرہ، مطبع المعارف ۱۳۳۴ھ، ج ۲، ص ۱۷ [23] الغزالی محمد بن محمد۔ المستصفیٰ من علم الاصول، مکتبہ التجاریہ ۱۳۵۶ھ ج ۲، ص ۹۰ [24] ایضاً، ج ۲، ص ۸۸۔ نیز ملاحظہ فرمائیں، جوینی عبدالملک بن عبداللہ امام الحرمین البرہان فی اصول الفقہ۔ قاہرہ۔ دارالانصار ۱۴۰۰ھ، ص ۷۶، ۵ [25] ارموی۔ سراج الدین

محمود بن ابی بکر۔ التحصیل من المحصول۔ بیروت موسسۃ الرسالہ ۱۹۸۸ء ج ۲، ص ۹۵۔ [۲۶] الباجی۔ الاشارہ فی اصول الفقہ۔ محولہ بالا ایڈیشن ص ۱۴۱، نیز ملاحظہ فرمائیں ابن قدامہ۔ روضۃ الناظر وجنۃ المناظر۔ قاہرہ۔ المطبعۃ السلفیہ ۱۳۹۱ھ، ص ۶۴ [۲۷] فخر الاسلام البزدوی۔ اصول البزدوی۔ کراچی، نور محمد کتاب خانہ۔ سن اشاعت نہیں ہے، ص ۱۴۹ [۲۸] عبد العزیز بخاری۔ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی۔ ملتان، مکتبہ قاسمیہ، سن اشاعت درج نہیں، ج ۳، ص ۲۵، [۲۹] سرخسی۔ اصول السرخسی۔ تحقیق ابوالوفا دا ہانی۔ قاہرہ۔ مطابع، دار الکتاب العربی ۱۹۷۲ء، ج ۱، ص ۳۸۱ [۳۰] الماوردی ابن الحسن محمد بن حبیب۔ ادب القاضی۔ تحقیق یحییٰ ہلال سرجان۔ بغداد مطبع ارشاد۔ ۱۳۹۱ھ، ج ۱، ص ۳۷۱ [۳۱] القرافی محمد بن ادریس۔ شرح تنقیح الفصول۔ مصر۔ المطبعۃ الخیریۃ ۱۳۰۶ھ، ص ۱۵۱ [۳۲] ابن حزم الظاہری۔ الاحکام فی اصول الاحکام مصر مکتبۃ الخانجی ۱۳۴۵ھ ج ۲، ص ۴۹ [۳۳] الفجر: ۳ [۳۴] ابن منظور الافریقی المصری۔ لسان العرب۔ تحقیق علی شیری بیروت، دار الاحیاء التراث العربی، ۱۴۰۸ھ، کتاب الواؤ باب الراء [۳۵] طوفی نجم الدین ابی الربیع۔ شرح مختصر الروضہ۔ بیروت، موسسۃ الرسالہ ۱۹۸۸ء، ج ۲، ص ۳۷، [۳۶] فواتح الرحموت ج ۲، ص ۱۱۵ [۳۷] عبد الکریم زیدان۔ الوجیز فی اصول الفقہ بیروت، موسسۃ الرسالہ ۱۴۰۵ھ ص ۱۶۹ [۳۸] ابن نجار، شرح الکوکب المنیر ج ۲، ص ۳۲۹ [۳۹] امام مسلم۔ صحیح مقدمہ، ج ۱، ص ۱۱ [۴۰] فواتح الرحموت ج ۲، ص ۱۲۰ [۴۱] شرح الکوکب المنیر، ج ۲ ص ۳۳۴ [۴۲] شرح تنقیح الفصول، ص ۱۵۲ [۴۳] فواتح الرحموت ج ۲ ص ۱۲۰ [۴۴] الوجیز فی اصول الفقہ، ص ۱۷۹ [۴۵] نجم الغنی۔ مزیل الغواشی۔ شرح اصول الشاشی، ملتان ۱۹۸۹ء، ص ۲۹۵ [۴۶] امام بخاری۔ صحیح۔ کتاب الایمان [۴۷] مزیل الغواشی ص ۲۹۵

وگ WIG کی شرعی حیثیت

از جناب نور احمد شاہتاز۔ کراچی

وگ کا مفہوم وگ WIG انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں اس کے معنی اَللِّمَّۃَ یا اَلجُمَّۃَ کے ہیں اور اسے قُصَّۃ یا کُبَّۃ بھی کہا جاتا ہے۔ جدید عربی میں وِگ کو "باروکا" کہا جاتا ہے۔ جو دراصل فرانسیسی لفظ کا چربہ ہے۔ وِگ ہی سے لفظ WIGGED بنا ہے۔ یعنی لابس الشَّعرِ المستعار یا لابِسُ اللِّمّۃ والجُمّۃ (وِگ پہنے ہوئے)[۱]

المنجد نے اللِّمّہ کے معنی بالوں کی زلف جو کانوں کی لَو سے بڑھی ہوئی ہو[۲] بیان کیے ہیں۔ جبکہ علامہ ابن منظور افریقی نے جُمّہ کی تعریف یوں بیان کی ہے۔

الجمہ: الشعر۔ وقیل الجمہ من الشعر اکثر من اللِّمّہ و فی الحدیث لعن اللہ المُجَمِّمات من النساء ھن اللواتی تَتَّخِذنَ شعورھن جُمَّۃً شِبھاً بالرجال[۳]

جمہ بالوں کو کہتے ہیں اور جمہ ان بالوں کو کہا جاتا ہے جو لِمہ سے زیادہ ہوں اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ نے ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے جو بالوں کے جوڑے یا گچھے بناتی ہوں تاکہ ان کے بال مردوں جیسے لگیں۔

اسی طرح حدیث شریف میں واصلہ اور مستوصلہ پر بھی لعنت آئی ہے۔ یعنی ایسی خواتین جو مصنوعی بال لگا کر اصل بال لمبے کریں اور کرائیں۔

وگ کیا ہے؟ عرف عام میں اصلی یا مصنوعی بالوں کا ایک گچھا ہے جسے ٹوپی نما طریقہ سے بنایا جاتا ہے تاکہ سر پر آسانی سے فٹ ہوسکے۔ انسائیکلو پیڈیا آف امریکانا کے مطابق THE WIG IS A COSMETIC HEAD COVERING OF ARTIFICAL OR HUMAN HAIR.[4]

وگ کی تاریخ | تاریخی اعتبار سے وگ کا استعمال خاصا قدیم ہے۔ انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق وگ قدیم مصری تہذیب کی ایجاد ہے اور اس کا استعمال مصری مرد و خواتین میں زیبائش حسن و آرائش گیسو کے طور پر عام رہا ہے[5] باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے اہل مصر کو قدرتی حسن سے حظ وافر عطا کیا اور حسن مصر ضرب المثل کے طور پر مشہور ہوا مگر اس قوم پر نمود و نمایش کا جذبہ اس قدر غالب تھا کہ اپنے قدرتی حسن پر اکتفا کرنے کے بجائے اس میں مزید چار چاند لگانے کی حرص و ہوس نے انہیں وگ کا استعمال سکھایا۔

قدیم مصریوں کے بارے میں یہ بات اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ انھوں نے قدرتی انعامات کو کبھی بھی کافی نہیں خیال کیا۔ بلکہ وہ ہمیشہ "ھل من مزید" کی فکر میں رہے۔ ان کی اس جبلت اور فطری عادت پر قرآن حکیم سب سے بڑا شاہد ہے۔ جس نے ان کے اس طبعی رجحان اور بے صبری و ناشکری پر درج ذیل شہادت دی ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ — اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم

عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ مِن بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ[6]

ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر (گذارا) نہیں کر سکتے، پس آپ اپنے رب سے مانگیے کہ وہ ہمارے لیے زمین سے اگنے والی چیزیں ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور کی دال اور پیاز وغیرہ مہیا کرے (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا کیا تم بہتر چیز کے بدلے میں ردی چیز چاہتے ہو۔

اس آیت طیبہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے معروف مصری عالم سید قطب شہید "فی ظلال القرآن" میں لکھتے ہیں:

"بنی اسرائیل کی حالت یہ تھی کہ وہ گرم و خشک صحرا اور پتھریلی زمین میں جھلستی ہوئی زندگی گذار رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پتھروں سے پانی نکالا اور آسمان سے من و سلویٰ اتارا، مگر ان کی فاسد طبیعت، بگڑی ہوئی ذہنیت اور پست فطرت نے انہیں اس مقام بلند تک نہ پہنچنے دیا۔ جس کے لیے وہ مصر سے نکالے گئے تھے"[7]

اس قرآنی آیت سے انسائیکلوپیڈیا کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وگ بھی مصریوں ہی کی ایجاد ہے کیونکہ اس میں بھی قدرتی حسن پر جو اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ عدم اکتفا کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں مزید اضافہ کرنے کی حرص کا جذبہ صاف جھلکتا ہے۔

وِگ کو خوبصورت بنانے کے لیے اسے مصنوعی، غیر قدرتی رنگوں میں بنایا جاتا تھا اور اس میں موتی اور زیورات کا جڑاؤ بھی کیا جاتا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ نے ایک قدیم وِگ ڈینش برونز (DENISH BRONES) کے زمانے کی دریافت کی ہے جو ۱۵۰۰ سے ۸۰۰ سال قبل مسیح کی معلوم ہوتی ہے۔

یونان میں بھی وِگ کا استعمال قدیم عرصہ سے چلا آرہا ہے۔ چنانچہ وہاں بھی مرد وعورت میں وگ کے استعمال میں مسابقت پائی جاتی ہے۔

سلطنت روما میں وِگ کو مقبولیت اس وقت حاصل ہوئی جب قیصر روم نے اپنا گنج چھپانے کے لیے وگ استعمال کی۔[۸]

مالدار رومن خواتین میں وِگ کے استعمال کا جنون اس حد تک تھا کہ وہ اصلی بالوں کی وِگ بنوانے کے چکر میں قید خانوں میں بند شمالی علاقوں کی خواتین کے سر منڈوا کر ان کے بالوں سے وگ بنواتی اور زیب تن کرتی تھیں۔[۹]

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں فرانس اور انگلینڈ میں وِگ کا استعمال اس وقت عام ہوا۔ جب لوئس سیزدہم (LOUIS XIII) نے اپنا گنج چھپانے کے لیے عدالت (COURT) میں وِگ پہن کر بیٹھنا شروع کیا۔ پھر تو وگ عدالتوں میں ججوں کے ہاں ایسی مقبول ہوئی کہ اسے باقاعدہ عدالتی لباس کا درجہ حاصل ہوگیا۔

آج بھی برطانیہ کی عدالت ہائے عالیہ میں جج صاحبان (JUDGES) لارڈ چانسلر بیرسٹرز اور بشپس (BISHOPS) وِگ کو عدالتی لباس کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔[۱۰]

کسی کے اصلی سر کے بالوں کی تعداد تو اللہ رب العزت ہی جانتا ہے مگر اس مصنوعی سر، وگ کے بالوں کی تعداد پچاس ہزار سے دو لاکھ کے درمیان ہوتی ہے۔

کیونکہ اس کی تیاری میں کم و بیش اتنے ہی بال یا مصنوعی ریشے درکار ہوتے ہیں۔[۱۱]

مسلمانوں کے ہاں وگ کے استعمال پر کوئی تاریخی شہادت دستیاب نہیں ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے وِگ پہننے کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے فقہاء کے نزدیک بالوں کے ساتھ اور بالوں کو ملا کر انہیں لمبا کرنا یا مصنوعی بال سر پہ لگانا حرام ہے۔ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ووصل الشعر بشعر الآدمی حرام، سواء اکان شعر المرأة او شعر غیرها لما فیہ من التزویر ......[۱۲]	وگ کی حرمت کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ یہ ایک طرح کا دھوکہ ہے اور دھوکہ دہی منع ہے۔ لہذا وگ لگانا منع ہوا۔"

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں یہود سے مشابہت پیدا ہوتی ہے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ کی مخالفت کا حکم دیا ہے اور ان کی سی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ بفحوائے "من تشبہ بقوم فهو منهم" تیسری وجہ یہ کہ وگ لگانا ایک قوم کے لیے ماضی میں عذاب بن چکا ہے اور جس امر سے عذاب الٰہی کے نزول کا امکان ہو اس کا ترک لازم ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب یہودیوں کی عورتوں نے بال لگانا شروع کیے تو ان پر بربادی مسلط کر دی گئی۔

ممانعت وحرمت کی چوتھی اور زیادہ قوی دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے استعمال سے منع فرمایا ہے اور حکم الٰہی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کام سے روکیں اس سے رکنا واجب ہے۔[۱۳] وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا

نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

نیز اصول فقہ کا مسلمہ قاعدہ یہ ہے کہ اللعنۃ علی الشئی تدل علی تحریمہ۔ (کسی شئے پر لعنت اس کے حرام ہونے کی دلیل ہے) لان فاعل المباح لا تجوز لعنہ کیونکہ کسی امر مباح پر لعنت کرنا جائز نہیں اور جب وگ کا استعمال ملعون عمل ٹھہرا۔ تو یہ مباح نہ رہا۔ بلکہ حرام ہوگیا۔

آج کل اصطلاح "قرآن و سنت" کا بڑا چرچا ہے حتیٰ کہ جاہل سے جاہل شخص بھی یہ کہتا ہے کہ قرآن و سنت کا حوالہ دیجیے، ایسے دور میں جب قرآن و سنت کا حوالہ مانگنے کا مطلب حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ اجمعین کی جچی تلی اور علمی آراء کو درخور اعتناء نہ سمجھنا ہو۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی سے منور فقہی آراء کے باوصف صریح احادیث بھی ذکر کر دی جائیں۔ تاکہ کسی کو فقہائے کرام کو وگ دشمن، قدامت پسند اور (NARROW MINDED) تنگ نظر کہنے کی جرأت کر کے گنہگار نہ ہونا پڑے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) کی وگ کے بارے میں بعض احادیث حسب ذیل ہیں:

۱۔ عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما قالت: لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الواصلۃ والمستوصلۃ[15]

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی پر لعنت فرمائی ہے۔

۲۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

قال لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ والواشمۃ والمستوشمۃ[16]

فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بال جوڑنے والی اور گودنے اور گدوانے والی پر لعنت فرمائی ہے۔

۳۔ عن سعید بن المسیب قال قدم معاویۃ المدینۃ آخر قدمۃ قدمھا فخطبنا فاخرج کبۃ من شعر قال: ما کنت اری احدا یفعل ھذا غیر الیھود ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سماہ الزور یعنی الواصلۃ فی الشعر[17]

حضرت سعید بن مسیب کا بیان ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جب آخری مرتبہ مدینہ منورہ آئے تو خطبہ دیتے ہوئے انہوں نے بالوں کا ایک گچھا نکالا اور فرمایا: میں نے یہودیوں کے علاوہ کسی اور کو یہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالوں کے جوڑنے کو دھوکہ بازی قرار دیا ہے۔

۴۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ والواشمۃ والمستوشمۃ[18]

حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بال جوڑنے والی اور بال جڑوانے والی گودنے والی اور گدوانے والی پر لعنت فرمائی ہے۔

۵۔ عن حمید بن عبد الرحمٰن

حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف کا بیان

بن عوف انہ سمع معاویہ
بن ابی سفیان عام حج وھو
علی المنبر وھو یقول وتناول
قصۃ من شعر کانت بید
حرس این علماؤکم سمعت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ینھی عن مثل ھذہ ویقول
انما ھلکت بنو اسرائیل حین
اتخذ ھذہ نساؤھم [19]

ہے کہ میں نے حضرت معاویہ بن
ابو سفیان رضی اللہ عنہما کو حج کے
سال (جس سال انہوں نے اپنے
زمانہ خلافت میں حج کیا۔) منبر پر
فرماتے ہوئے سُنا: انہوں نے بالوں
کا گچھا جو ایک سپاہی کے ہاتھ میں تھا
لیتے ہوئے فرمایا تمہارے علماء کہاں
ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو ایسا کرنے سے منع فرماتے
ہوئے سُنا۔ آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل
اسی لیے ہلاک ہوئے۔ جب ان کی
عورتوں نے ایسا کرنا شروع کر دیا۔

اس سلسلہ کی مزید احادیث بھی ہیں جن کو طوالت کے خوف سے نقل نہیں کیا گیا ہے۔ ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وگ کا استعمال ممنوع وحرام ہے۔ کیونکہ یہ دھوکہ ہے۔ اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ وگ اصل بالوں کے ساتھ مصنوعی بالوں کا ملانا، بالوں کو مصنوعی طریقہ سے بڑھانا یا اصل بالوں کی بجائے مصنوعی بالوں کا استعمال کرنا ہے اور یہ سب ممنوع، حرام اور ملعون ہے۔

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ بصورت مجبوری ایسا کرنا جائز ہوگا۔ مندرجہ ذیل حدیث سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے۔

.... عن اسماء بنت ابی بکر
رضی اللہ عنہما قالت جاءت
امراۃ الی النبی صلی اللہ علیہ
وسلم فقالت یا رسول اللہ
ان لی ابنۃ عریسا اصابتھا
حصبۃ فتمرق شعرھا
افاصلہ فقال لعن اللہ
الواصلۃ والمستوصلۃ
.... [20]

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ
عنہما بیان کرتی ہیں کہ ایک خاتون
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضر ہوئیں اور عرض کی میری
ایک بیٹی کی شادی ہے اور اس کے
سر کے بال خسرہ کی وجہ سے جھڑ گئے
تھے۔ کیا (آپ اجازت دیتے ہیں کہ)
میں اس کے بالوں کو گانٹھ کر لمبے
بنا دوں تو آپ نے فرمایا! اللہ تعالیٰ
نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی
پر لعنت کی ہے۔

اس مفہوم کی متعدد احادیث صحیح مسلم اور دوسری کتب حدیث میں موجود ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنوعی بال (وگ) لگانا حرام ہے۔

وگ کی حرمت کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف "صحیح بخاری" میں ایک مستقل عنوان اس کے متعلق قائم کیا ہے۔ دیکھئے صحیح بخاری باب نمبر ۵۳۶ "الوصل فی الشعر" [21]

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وگ کا استعمال قطعاً ممنوع ہے لہذا مسلمانوں کو اس کے استعمال سے احتراز کرنا چاہیے اور نوجوان نسل کو خاص طور پر اس کے والدین، اساتذہ، علماء اور مبلغین اس کے استعمال سے باز رکھیں

تاکہ وہ اتباع رسولؐ کرکے حرام کے ارتکاب سے محفوظ رہے۔

حوالہ جات

۱؎ منیر البعلبکی، المورد ص ۱۰۶۳، بیروت ۲؎ لوئیس معلوف المنجد تحت
کلمہ لمۃ ۳؎ ابن منظور افریقی، لسان العرب مجلد ۱ ص ۶۸۸ بیروت ۴؎
GROLIER ACADEMIC ENCYCLOPAEDIA, AMERICA
VOL: 20, P.147 ۵؎ انسائیکلوپیڈیا امریکانا ENCYCLOPAEDIA-
AMERICANA, VOL: 28, P.751 - ۶؎ القرآن، البقرہ: ۲۱۲ ۷؎ سید
قطب شہید تفسیر فی ظلال القرآن تحت آیت: ۲۱ ۸؎ انسائیکلوپیڈیا امریکانا
مجلد ۲۸ تحت لفظ وگ ص ۷۵۱ ۹؎ ایضاً- ENCYCLOPAEDIA AMRRI-
CANA VOL: 28, P.751 - ۱۰؎ ایضاً- THE MACMILLAN FAMI-
LY ENCYCLOPAEDIA. VOL: 20. P.146 - ۱۱؎ تھوس ایل ہیرلیس،
GROLIER ACADEMIC ENCYCLOPAEDIA, VOL: 20, P.147
۱۲؎ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دار الفکر بیروت (مجلد اول)
۱۳؎ ایضاً ۱۴؎ ایضاً ۱۵؎ البخاری، صحیح بخاری کتاب اللباس باب الوصل فی الشعر حدیث نمبر ۸۸۶
۱۶؎ صحیح مسلم بشرح النووی ج ۱۴ ص ۱۰۶ بیروت حدیث نمبر ۸۷۷ " " " "
۱۷؎ " " " " " ۸۷۸ " ص ۱۰۹
۱۸؎ " " " " " ۸۷۳ " " "
۱۹؎ " " " " " " " ص ۱۰۸
۲۰؎ " " " " " ۸۷۵ " ص ۱۰۲
۲۱؎ " " " باب نمبر ۵۳۶

مستقیم جنگ نامی کی اردو مثنویاں

از ڈاکٹر سید سجاد حسین۔ ریڈر شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی

غلام اعز الدین خاں بہادر مستقیم جنگ نامیؔ، حامد علی خاں مرحوم کے فرزند اور سلطان النساء بیگم عرف بڑی بیگم کے داماد تھے۔ مولف تذکرۂ صبح وطن نواب محمد غوث خاں بہادر اعظم نے غلام علی آزاد کے حوالہ سے نامیؔ کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء بتائی ہے[1] نامی کا تاریخی نام غلام علی تھا جس سے سنہ ۱۱۸۱ھ تاریخ نکلتی ہے۔

مستقیم جنگ نامی کے والد حامد علی خاں مرحوم لکھنؤ کی ایک مشہور و معروف مردم خیز سرزمین گوپامؤ کے رہنے والے تھے، آرکاٹ کے والا جاہی خاندان کے زمانے میں گوپامؤ کی بہت سی علم دوست، ادب نواز، دینی و مذہبی علوم کی حامل شخصیتیں مدراس آئیں اور مختلف سرکاری عہدوں پر فائز ہوئیں، ان میں سے ایک حامد علی خاں گوپامئوی بھی تھے[2] نواب محمد علی والا جاہ سے رشتۂ وطنیت کے علاوہ ان کی قریبی رشتہ داری بھی تھی۔

غلام اعز الدین خاں بہادر مستقیم جنگ نامیؔ مدراس میں پیدا ہوئے سن شعور کو پہنچنے کے بعد مختلف اساتذۂ وقت سے عربی اور فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔

---

[1] تذکرۂ صبح وطن۔ نواب محمد غوث خاں اعظم، مطبوعہ مدراس ۱۸۴۲ء [2] نوبہار عشق، مرتبہ محمد یوسف کوکن، ص۱ مطبوعہ مدراس یونیورسٹی ۱۹۵۵ء۔

مولوی حافظ محمد حسین سے فن عروض سیکھا[1] اور علامہ روزگار مولانا باقر آگاہ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہوا۔[2] اس طرح عربی و فارسی علوم و فنون میں انہیں خاصی دسترس حاصل ہوگئی۔ بچپن ہی سے طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی چنانچہ شعر کہنا شروع کیا۔ اس فن میں مولانا باقر آگاہ جیسی فقید المثال ہستی کی اصلاح و تربیت نے ان کی شاعری کو مزید جلا بخشی اس طرح وہ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ شاعری میں انہوں نے اپنا تخلص کبھی مستقیم اور کبھی نامی ظاہر کیا ہے۔

نامی کو عمدۃ الامرا کے درباری شاعر ہونے کا شرف بھی حاصل رہا۔ نواب عمدۃ الامرا جب مسند آرائے ریاست ہوئے تو انہوں نے نامی کو ملک الشعرا اور مستقیم جنگ بہادر کے معزز خطابات سے سرفراز کیا۔[3] نامی نے ایک اردو دیوان کے علاوہ متعدد مثنویاں مثلاً نوبہار عشق۔ بہارستان عشق۔ سلیمان نامہ۔ وفات نبیؐ گنج قدرت۔ قصۂ بنارس، قصہ بی بی مریم اور داغستان کلفت وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ نامی کا انتقال ۱۸ ر جمادی الاول ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء کو مدراس میں ہوا۔[4] اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی اور آپ کو ساحل مدراس کے قریب اپنے ایک باغ میں سپرد خاک کیا گیا جہاں آج پریسیڈنسی کالج قائم ہے۔

۱۔ اشارات بینش۔ سید مرتضیٰ بینش، مطبوعہ مدراس ۱۲۶۸ھ ۲۔ بحوالہ مدراس میں اردو ادب کی نشو نما ص ۱۹۰ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال مطبوعہ ۱۹۶۹ء، حیدرآباد ۳۔ تذکرۂ گلزار اعظم ص ۳۵۵ نواب غلام غوث خاں اعظم، مطبوعہ مدراس ۱۲۷۲ھ ۴۔ عربک پرشین ان کرناٹک ... یوسف کوکن، مطبوعہ مدراس ۱۹۷۴ء۔

اس مضمون میں راقم نے مستقیم جنگ نامی کی مذکورہ بالا اردو مثنویوں میں نوبہار عشق۔ بہارستان عشق۔ سلیمان نامہ۔ گنج قدرت اور وفات نبی کا تعارف اور جائزہ پیش کیا ہے۔ باقی مثنویاں دستیاب نہ ہوسکیں اس لیے ان کا تذکرہ نہیں کر سکا۔

مستقیم جنگ نامی کے مندرجہ ذیل اشعار سے بھی موصوف کی ان مثنویوں کے نام کا پتہ چلتا ہے جو "سلیمان نامہ" سے پہلے لکھی گئیں۔

کہا پہلے میں نے بحسن نظام — حکایات شیریں و خسرو تمام
جو بعد اس کے پھر میں نے کھولی زبان — کیا قصہ قیس و لیلی بیان
سعادت نے پھر رہنمائی جو کی — لکھا مثنوی وفات نبیؐ
کیا فکر پھر ساقی نامہ وہیں — بنارس کا قصہ لکھا بعد ازیں
کہو اب بفضلِ خدا و نبیؐ — حکایت سلیمان و بلقیس کی

۱۔ مثنوی نوبہار عشق :۔ یہ ۱۲۱۱ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس کا دوسرا نام قصہ خسرو شیریں و فرہاد ہے۔ یہ نامی کی اولین اردو مثنوی ہے جو کل تین ہزار سات اشعار پر مشتمل ہے اس میں ایک مشہور عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ اس مثنوی کی تالیف کے وقت بقول مصنف وہ عمر کے لحاظ سے جوان تھے اور عین جوانی کی یہ اولین تصنیف امید ہے دنیا میں ایک دائم نشانی بن کر رہے گی چنانچہ کہتے ہیں:

کہا میں اس کو در عین جوانی — رہے گی جگ میں یہ دائم نشانی
اگرچہ اول یہ تصنیف ہو گی — ولیکن قابل تعریف ہو گی

اس مثنوی کے نام اور سن تالیف سے متعلق مثنوی کے مندرجہ ذیل اشعار سے

شہادت ملتی ہے۔

کیا جب خامہ گلریزی کو اتمام — رکھا میں نو بہار عشق اسے نام

سن ہجری تھا بارہ سو پہ گیارہ — کہ میں اس مثنوی کے تئیں سنوارا

کہا تاریخ ہاتف از مسرت — کہا نامی نے یہ شیریں حکایت (۱۲۱۱ھ)

نوبہار عشق کے اشعار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نامی کو اپنی اس تالیف پر صرف نازہی نہیں بلکہ اس کے طرز بیان پر بجا طور پر فخر بھی تھا، کہتے ہیں:

کیا اس بحر میں فکر ایک مہینہ — نو ماہ نو سا نکلا یہ سفینہ

ذرا دیکھو اسے کر غور یارو — کرو دریافت اس کا طور یارو

کہے کوئی اگر یک بیت بہتر — تو کہتے ہیں کہ ہو دیوان کے ہمسر

نوبہار عشق کا قلمی نسخہ کتب خانہ عام اہل اسلام مدراس میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ خوش خط میں لکھا ہوا ہے اور خاتمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنف کی زندگی میں ان کی صاحبزادی کے لیے لکھا گیا تھا۔

نامی کی نوبہار عشق کا قصہ دو مشہور فارسی شعرا نظامی اور امیر خسرو کی اسی موضوع پر لکھی ہوئی مثنویوں سے ماخوذ ہے۔ اس قصہ کو اردو میں ڈھالتے وقت نامی نے مذکورہ مثنویوں کی لفظ بلفظ پیروی نہیں کی ہے بلکہ حسب ضرورت جابجا حذف و اختصار سے کام لیا ہے نیز زور بیان کی غرض سے محض قصہ کے اہم پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ مثنوی کی زبان صاف سلیس اور سادہ ہے۔ اس میں نامی نے اپنے استاد آگاہ کی طرح ٹھیٹھ دکنی زبان اختیار نہیں کی بلکہ اسکو نہایت ہی صاف اور عام فہم اردو میں پیش کیا ہے۔ ان کے اظہار بیان میں سادگی

صفائی اور اصلیت پائی جاتی ہے البتہ کہیں کہیں دکنی محاورے بھی در آئے ہیں۔ اشعار میں سلاست، روانی کے ساتھ ساتھ بقول مصنف رنگینی۔ حلاوت اور شیرینی بھی پائی جاتی ہے۔

یہ قصہ خسرو و شیریں و فرہاد — کیا ہندی سیتے نامی نے ایجاد

ہے رنگینی میں روے گل سے رنگین — حلاوت میں ہے شیرینی سے شیریں

۲۔ مثنوی بہارستان عشق:- یہ کل دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۲۱۳ھ ہے۔ مثنوی کے خاتمے پر نامی نے مادۂ تاریخ نکالا ہے اور اشعار کی تعداد اور مثنوی کے نام کی نشاندہی بھی کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں:

دل میں کر تاریخ کا اس کے خیال — جب کیا پیر خرد سے میں سوال

یوں کہا ہے کھینچ کر کے آہ سرد — اس کی اب تاریخ ہو گی داغدار (۱۲۱۳ھ)

دیکھ یہ سرسبز کشت اہل عشق — پھر کہا ہے یہ بہشت اہل عشق (۱۲۱۳ھ)

ہے تر و تازہ جو یہ بستان عشق — نام اس کا ہے بہارستان عشق

میں کیا جب اس کے بیتوں کو شمار — پایا گنتی میں برابر دو ہزار

مذکورہ مثنوی میں لیلیٰ مجنوں کی مشہور داستان نظم کی گئی ہے، داستانی مثنویوں کی عام روایت کے مطابق قصے کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے ۔

کون کر سکتا ہے حمد کردگار — عقل ہے مجنوں جہاں لیلیٰ و نہار

ہوش و فہم و وہم اور ذہن و ذکا — اس محل میں سربسر ہیں نارسا

عقل کی کرسی اگرچہ عرش ہے — پر ثنا میں اس کے دائم فرش ہے

حمد و نعت اور واقعہ معراج کے اظہار کے بعد مناجات ہے۔ پھر نواب

عمدۃ الامرا بہادر کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے اس کے بعد اپنے دونوں صاحبزادوں احمد حسین اور حید رحسین کو مختلف نصیحتیں کی ہیں اور ان کو علم دین حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے یوں لکھا ہے :

ایک نکتہ ہے خردمندوں کو بس — علم دین حاصل کرو باقی ہوس
علم دین فقہ است و تفسیر و حدیث — ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث
ہووے فرزندوں کو میرے عنقریب — یا الٰہی علم کی دولت نصیب

سبب تصنیف کے بیان میں نظامی کی پیروی کا اعتراف کرتے ہوئے نامی اس کی شاعرانہ عظمت کے اس طرح قائل ہیں :

وہ نظامی جو ولی اللہ تھا — مثنوی گویوں میں شاہنشاہ تھا
اس لیے اسکی جو کر کے پیروی — بولتا ہوں میں یہ ہندی مثنوی

مثنوی کے سبب تالیف کے بعد نامی ناقدری زمانہ کی شکایت کرتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں :

ہے امید آفریں نامی محال — اس زمانے میں نہیں قدر کمال
چاشنی اس کی نہیں اس دہر میں — جانتے نہیں فرق شہد و زہر میں
قدر علم و فضل اب بالکل نہیں — فضل میں اس عصر کے یہ گل نہیں
شاعراں پھیلے ہیں ایسے ہر کہیں — وزن کی بھی جن کو پہچانت نہیں
قافیہ جانیں نہ پہچانیں ردیف — ایسے اپنے شعر پر بن کے حریف
ہیں فصاحت میں زبس بے امتیاز — شعر مہمل پر ہے اپنے ان کو ناز
شاعری میں ہی نہیں کچھ بے بدل — ہوں گے وہ سب چیز میں ضرب المثل

اس مثنوی میں قدیم روایات و رسوم کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اس میں تخیلات کی بلند پروازی سے زیادہ افسانوی حقیقت نظر آتی ہے۔ قصہ رومانی حیثیت رکھتے ہوئے بھی کسی طرح رومانٹک نہیں ہے۔ موضوع اہم اور مفید نہ ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے۔ عشق و محبت کی داستان ہے لیکن اپنے دامن میں دینی علمی اور سماجی تصورات کے گہرے نقوش رکھتی ہے جو اس وقت کے معیار زندگی کی بھرپور ترجمان ہے۔ اس مثنوی کی زبان سلیس اور پیرایۂ بیان پر لطف و دلکش ہے ایجاز و اختصار اس مثنوی کا خاص جوہر ہے۔ صنعتوں کا استعمال بڑی خوبی سے ہوا ہے جس کی وجہ سے قصے میں لطف اور دلچسپی دوبالا ہو جاتی ہے۔ نامی نے اس مثنوی میں جہاں کہیں بھی دکھنی روزمرہ کا استعمال کیا ہے علی الاعلان کیا ہے چنانچہ خود ہی خاتمۂ کتاب میں کہتے ہیں :

نظم یہ اردو زبان میں، میں کیا — فکر میں اس کے بہت محنت سہا
روزمرہ میں جو اس کے ہو خلل — یہاں نہیں ایران کا ہرگز محل
کیونکہ کرناٹک میں ہے میرا مقام — یہاں کے لوگوں کی زبان دکھنی تمام
ہند ہے میرے بزرگوں کا وطن — مولد اس عاصی کا ہے چینا پٹن[1]
منصفو انصاف سے دیکھو ذرا — مثنوی کس دھوم سے نامی نے کہا[2]

۳- مدینۃ الانوار موسوم بہ وفات نبی : یہ مثنوی ۱۲۱۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں چھوٹی تختی کے تقریباً ۱۲۰۰ شعر ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خاندان شرف الملک' دیوان صاحب باغ مدراس میں محفوظ ہے۔ کتابت

[1] مدراس کا قدیم نام [2] نامی ۔ بہارستان عشق، مخطوطہ نمبر ۵، ۴م، اسٹیٹ لائبریری، حیدر آباد۔

صاف اور دیدہ زیب ہے۔ مثنوی کے خاتمے پر قطعہ تاریخ سے مثنوی کے نام اور سن تصنیف کی شہادت ملتی ہے:

اس رسالے کو میں نے کر تیار   نام رکھا مدینۃ الانوار

ختم کر جب وفات کا احوال   اس کی تاریخ کا کیا میں خیال

سن کے ہاتف نے یہ کہا درود

صلوٰۃ خدا نبی پہ پڑھو
۱۲۱۹ھ

اس مختصر مثنوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ مرض و وفات نظم کیے گئے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مثنوی دراصل روایات و احادیث کا منظوم ترجمہ ہے۔ حمد و نعت اور مناجات کے بعد نامی اپنے استاد کی مدح سرائی میں حسب ذیل اشعار قلم بند کر کے اپنا حق شاگردی اس طرح ادا کرتے ہیں:

منبع فضل مولوی باقر   عالمِ علم باطن و ظاہر

اس قدر علم کا ہے اسمیں کمال   جسکی اس عصر میں نہیں ہے مثال

فقہ و تفسیر اور حدیث و سیر   اسکو اس علم میں ہے خوب خبر

عربی فارسی میں کامل ہے   نظم اور نثر بیچ قابل ہے

ہے تصانیف اس کے بے تعداد   اس زمانے کا ہے بڑا استاد

عالم باعمل ہے وہ واللہ   اس کو کہنا بجا ہے حق آگاہ

سب فضائل میں بس گرامی ہے   ثانی نظامی و جامی ہے

دیکھ کر اس کے قدرت تصنیف   کہے علامہ اس کو میر و شریف

اس کے بعد سبب تالیف کا بیان ہے جو نامی پر طاری شدہ غم و الم کے

سیاہ بادلوں سے نجات حاصل کرنے اور حضور اقدسؐ کی وفات حسرت آیات کے احوال لکھنے کی طرف مائل ہونے کی تفصیل پر محیط ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا کہوں کس طرح تھا میں مغموم   حال میرے خدا کو تھا معلوم

اس میں پیر خرد شتاب آ کر   یوں لگا کہنے مجھ کو سمجھا کر

کیوں تو بیٹھا ہے اس قدر دلگیر   تو جوانی میں کیوں ہوا ہے پیر

غم دنیا سے کیا تجھے حاصل   واسطے اسکی کیوں ہے تو بے دل

عمر ضایع نہ کر تو اس غم میں   اس الم سے نہ رہ تو ماتم میں

مت تو دنیا کا درد ہر دم کر   نامہ معصیت کو دھویا کر

اب تو رقت سے دل کی کہہ فی الحال   مصطفیٰؐ کی وفات کا احوال

سنتے ہی پیر عقل سے یہ بات   غم دنیا سے میں نے دھویا ہاتھ

اور میں پھر مستعد ہوا اس پر   کہ کروں سیر گلستاں سیَر

مثنوی کا اصل موضوع احوال مرض الموت اور وفات نبیؐ پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں نامی نے ایک سچے عاشق رسولؐ کی حیثیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری و وفات سے متعلق تمام حالات معتبر روایات کی روشنی میں نظم کیے ہیں۔ مرض کے دوران حضورؐ کی وصیتیں، ہدایات و خطبات کو الگ الگ سرخیوں کے تحت تفصیل سے سمیٹا گیا ہے، نیز حضرت ابو بکرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی معتبر روایتوں سے حضورؐ کے مرض و وفات سے منسوب سارے واقعات اس مثنوی میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ آخر میں نامی مزار اقدس کی زیارت کی تمنا دل میں لیے اللہ

سے اس طرح دعا کرتے ہیں:

یا الٰہی زیارت سالار   کرے میرے نصیب کبھی یکبار
پھر محبت نبیؐ کی سینے میں   جلد پہنچا مجھے مدینے میں
رہے وابستہ یا الٰہی سدا   سر مرا اور آستاں اس کا
کر مرے تن بدن کو بعد ممات   خاک کوئے نبی علیہ الصلوٰۃ
اور شفاعت دے اسکی روز قیام   مجکو یا ذوالجلال والاکرام

یہ مختصر مثنوی ۱۲۹۱ھ میں مطبع نظام المطابع مدراس سے شایع ہوئی اس مثنوی کی زبان اول الذکر دو مثنویوں کے مقابلے میں نہایت ہی شستہ اور صاف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نامی کی یہ مثنوی زبان و اسلوب نگارش کے ارتقائی منازل کی طرف اٹھتا ہوا پہلا قدم ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ مثنوی کے نفس موضوع کو دیکھ کر یہ خیال گزرتا ہے کہ نامی نے یہ مثنوی ثواب آخرت کمانے کے لیے لکھی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جذبۂ خلوص میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ اردو کی قدیم مثنویوں میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۴۔ **سلیمان نامہ موسوم بہ بوستان بہشت**: یہ طویل مثنوی بقول مصنف ۱۲۲۵ھ میں شروع ہوئی اور ۱۲۲۶ھ میں تقریباً ایک سال بعد اختتام کو پہنچی۔

جو پوچھا میں سال شروع کتاب   کہا روضۂ حور نے کر حساب
یکایک سروش سعادت سرشت   کیا ہے ندا بوستان بہشت
۱۲۲۶ھ

نامی کی یہ سب سے اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس مثنوی کا ایک

قلمی نسخہ کتب خانہ خاندان شرف الملک دیوان صاحب باغ مدراس میں محفوظ ہے۔ کتابت نہایت صاف ستھری ہے۔ مثنوی کے کل اشعار کی تعداد تقریباً ۳۹۰۰ ہے۔ یہ مثنوی بڑی تختی پر لکھی ہوئی ۲۶۵ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر ۱۵ اشعر درج ہیں۔ اس مثنوی کا نفس موضوع حضرت سلیمان علیہ السلام کا وہ مشہور قصہ ہے جو قرآن مجید اور تفسیروں میں بیان ہوا ہے۔

قصہ کا آغاز حسب روایات حمد و نعت اور احوال معراج سے ہوتا ہے اسکے بعد مصنف نے کتاب کی تصنیف کا سبب مندرجہ ذیل اشعار میں ظاہر کیا ہے:

مجھے ایک دن دل میں آیا خیال   کہ جاتے ہیں جب رائگاں ماہ و سال
نہ ہوتا ہے دیں کا نہ دنیا کا کام   گذرتی ہیں بے فائدہ صبح و شام
زمانے کی فکروں میں جاتی ہے عمر   جو جاتی ہے پھر کر کب آتی ہے عمر
کچھ اس زندگی کا بھروسہ نہیں   کوئی جگ میں دایم جیا ہے کبھی
اسی کا ہوا جگ میں مشہور نام   کیا جس نے کر کے بھلائی کا کام
بفضل خدا میں ہوں صاحب سخن   سخن کہنے میں کیوں نہ کھولوں دہن
کوئی مثنوی اور تازہ لکھوں   مناسب نہیں ہے کہ یوں چپ ہوں
کہوں اب بفضل خدا و نبی   حکایت سلیمان و بلقیس کی
کروں اسکی تفصیل سے اب بیان   نہایت عجائب ہے یہ داستان

داستان حضرت سلیمان و بلقیس کا لب لباب یہ ہے کہ جب حضرت داؤدؑ کے انتقال کا وقت قریب آیا تو خدا نے حضرت جبرئیلؑ کو بھیجا تاکہ حضرت داودؑ کے اٹھارہ لڑکوں سے مختلف سوال کیے جائیں جو لڑکا صحیح جواب دے اس کو سلطنت

عطا کی جائے چنانچہ حضرت جبرئیلؑ نے ان سب سے یکے بعد دیگرے مختلف سوالات کیے ان سب میں حضرت سلیمانؑ نے صحیح جوابات دیے جس کی بنا پر انہیں انگوٹھی عطا ہوئی جس میں جن و پری اور دیوؤں کی تسخیر کی طاقت موجود تھی۔ اللہ کے حکم سے حضرت سلیمانؑ بیت المقدس کی تعمیر کرتے ہیں اور پھر تمام جن وانس اور چرند پرند کو دعوت دیتے ہیں مگر ایک مچھلی دریا سے نکل کر سارے لوازمات ہضم کر جاتی ہے اس کے بعد حضرت سلیمانؑ کی بادشاہ نویرہ سے جنگ ہوتی ہے اور آپ اس کی بیٹی سے شادی کرتے ہیں۔ اس اثنا میں آپ کی انگوٹھی چوری ہو جاتی ہے اور حکومت بھی چلی جاتی ہے۔ پھر آپ ایک عورت سے نکاح کرتے ہیں تو دوبارہ انگوٹھی بھی واپس مل جاتی ہے۔ اس کے بعد حضرت سلیمانؑ دو زاہدوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ آپ کو پیغمبری ملتی ہے۔ جب آپ سیر کی غرض سے اپنے ساتھی کو لیکر کوہ قاف جاتے ہیں تو وہاں آپ کا ساتھی ایک پری سے شادی کرتا ہے جس کے بطن سے بلقیس پیدا ہوتی ہیں۔ ایک بادشاہ بلقیس کے حسن پر فریفتہ ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر وہ ناراض ہو کر اس سے جنگ کرتی ہے اور بادشاہ قتل ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں حضرت سلیمانؑ کے پاس ہدہد شہر سبا سے بلقیس کا پیام لاتا ہے دونوں کے درمیان نامہ و پیام جاری ہوتا ہے اس کے بعد ایک عالی شان محل تعمیر ہوتا ہے اور حضرت سلیمانؑ کی بلقیس سے شادی ہوتی ہے ایک مدت تک دونوں کی گذر بسر ہوتی ہے۔ اس کے بعد بلقیس کا انتقال ہوتا ہے اور پھر حضرت سلیمانؑ بھی انتقال کر جاتے ہیں۔

نامی نے اس واقعہ کو دلچسپ بنانے کے لیے جا بجا نہایت شگفتہ زبان اور

دلکش انداز بیان اختیار کیا ہے۔ بعض مقامات پر ان کی زبان اتنی رواں اور الفاظ کا انتخاب اتنا فطری نظر آتا ہے کہ اگر ہم مذکورہ مثنوی کے اشعار کو نامی سے منسوب نہ کریں تو بلاشبہ ہمارے دل میں میر حسن اور نسیم کی زبان کا گمان گذرنے لگتا ہے۔ یہاں اس کی تصدیق کے لیے نامی اور میر حسن کے اشعار بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

نامی	میر حسن
عرب کے جزیرہ میں ہے ایک شاہ	کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ صاحب خزانہ ہے صاحب سپاہ	کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
بہت فوج رکھتا ہے اور مال بھی	بہت حشمت و جاہ مال و منال
بڑا ملک ہے خوب اقبال بھی	بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال
کسی کو بھی خاطر میں لاتا نہیں	کئی بادشاہ اس کو دیتے تھے باج
تکبر کے مارے سماتا نہیں	خطا و ختن سے وہ لیتا خراج
کیا فوج تیار وہ نابکار	بہت ملک پر جان کھویا کیا
لڑائی کرنے لگا شور شار	بہت فکر دنیا میں سویا کیا
کہا شاہ ملک اسکا لوٹو تمام	رہے اس کے اقلیم زیر نگیں
کرو شہروں میں دمبدم قتل عام	غلامی کریں اسکی خاقان چین
لگی ہونے اس ملک میں مار مار	وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ
ہوئی قتل فوج اسکی سب ایک بار	کہ ہوتی ہے اب اسکی حالت تباہ
غرور اور زر و سیم سارا گیا	لٹایا بہت باپ نے مال و زر

خزانہ گیا شاہ مارا گیا[1] | ولیکن نہ پائی کچھ اس کی خبر[2]

غرض کہ قصے کی ترتیب، خارجی مناظر اور جذبات و احساسات کی تصویر کشی حسن ادا اور زور بیان کے اعتبار سے نامی کی یہ مثنوی آج سے تقریباً تین سو سال پہلے کے قدیم اردو ادب میں گوہر شب چراغ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ واقعی ایک ایسی یادگار ہے جس سے اس کا نام تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

۵۔ گنج قدرت: ۔ مستقیم جنگ نامی کی یہ مثنوی احوال قادر ولیؒ اور ان کی کرامات کے بیان میں ہے۔ اس مثنوی میں کل ۱۱۷۳۰ ابیات ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتبخانۂ عام اہل اسلام مدراس میں محفوظ ہے۔ مثنوی کا نام اور اسکی تاریخ تصنیف کے بارے میں نامی اس طرح رقمطراز ہیں ؎

یہاں نامی تو لکھ تاریخ اور نام | بیان کر جلد اس کا سال اتمام
بنی جب یہ کتاب باسعادت | رکھا نام اس کا گنج قدرت
کیا میں فکر تاریخ نظامت | کہا ہاتف نے اشعار کرامت ۱۱۳۳ھ

یہ مثنوی مطبع عزیزیہ مدراس سے ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں شایع ہو چکی ہے[3] لیکن اس کے مطبوعہ نسخے دستیاب نہیں ہیں۔

نامی کو اپنی اس مثنوی پر ناز تھا کیونکہ بقول مصنف یہ طویل نظم دو ماہ کے مختصر سے عرصے میں خون پسینہ ایک کرکے لکھی گئی تھی، چنانچہ کہتے ہیں:

[1] نامی۔ سلیمان نامہ [2] مثنوی سحر البیان۔ میر حسن [3] نو بہار عشق ص۲ مرتبہ محمد یوسف کوکن۔ مطبوعہ مدراس یونیورسٹی ۱۹۵۵ء۔

لہو کو کر پسینہ دو مہینے | تراشا لخت دل سے یہ نگینے
سنے گا جو کوئی یہ نظم دلکش | کرے گا شاد ہو البتہ عش عش
نئے مضمون کو رنگین کیا ہوں | زمین شعر کو زینت دیا ہوں
جسے کچھ شاعری میں ہووے گی راہ | وہی میرے سخن سے ہوگا آگاہ

نامی کو حضرت قادر ولی عرف شاہ میراں سے والہانہ محبت تھی چنانچہ وہ اس مثنوی میں اپنی عقیدت اور روحانی وابستگی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

میں آگے چار سال اس جا گیا تھا | مشرف اس زیارت سے ہوا تھا
ارادہ ہے کہ پھر میلے میں اس سال | رسالہ نذر لیکر جاؤں فی الحال
صلہ اسکا شتاب اس شاہ سے لیوں | جو کچھ لینا ہے اس درگاہ سے لیوں

غرض یہ مثنوی حضرت نامی کے جذبۂ عقیدت اور ان کے دلی احساسات کی آئینہ دار ہے۔ نامی نے جنوبی ہند کی جس بزرگ شخصیت کے احوال و کرامات کو موضوع بحث بنایا ہے انہیں دنیا شیخ شاہ الحمید میراں عبدالقادر جیلانی (المتوفی ۹۷۸ھ) المعروف بہ قادر ولی کے نام سے جانتی ہے۔ شاہ الحمید سنہ ۹۱۰ھ مطابق سنہ ۱۵۰۲ء میں مانک پور میں پیدا ہوئے[1] اور کم عمری ہی میں دینی خدمت کے لیے وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔

برہان خاں ہانڈی مولف توزک والاجاہی کے مطابق حضرت قادر ولی سید محمد غوث گوالیاری کی ہدایت پر پہلے ترچنا پلی نظر نگر میں نظر ولی سے

[1] معارف ماہ مئی ۱۹۹۱ء مضمون از شاکرہ بیگم، ص۳۸۱۔

ملاقات کرکے ناگور پہنچے اور یہیں دین و مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے ۱۰۴۸ھ میں وفات پائی[1]۔ ان کی درگاہ آج بھی زیارت گاہ عام ہے اور یہاں ہر سال عرس بہت دھوم دھام سے ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں بڑی عقیدت سے شریک ہوتے ہیں۔

حضرت قادر ولی کے روحانی فیوض و کرامات اور حالات زندگی پر مشتمل ایک مبسوط رسالہ "کنز الکرامات" عربی و فارسی دونوں زبانوں میں دستیاب ہے۔ اسے امیر الملک عماد الدین محمد خان بہادر کی فرمائش پر نامی نے "گنج قدرت" کے نام سے اردو کا منظوم جامہ پہنایا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

غرض بیٹا مرا داماد اس کا ۔۔۔ مخاطب محی الدولہ[2] سے جو ہوگا
زبانی اس کے مجھکو بول بھیجا ۔۔۔ کہ لکھ احوال تو قادر ولی کا
شتاب اس نثر کو تو نظم کر دے ۔۔۔ مضامین کو دُرِ معنی سے بھر دے

اس مثنوی کی زبان بھی صاف و شستہ ہے۔ اشعار میں جو سلاست اور روانی ہے وہ قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ بعض اشعار تو موجودہ دور کی زبان سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں مثلاً نامی کا یہ شعر ؎

مجھے اس بات کا ناحق گمان ہے ۔۔۔ ہنر کی قدر دانی اب کہاں ہے

الغرض نامی نے اس مثنوی میں اپنی شعری صلاحیتوں سے یہ واضح کر دیا ہے کہ ایک اچھا فنکار ملک کے کسی بھی گوشے میں جنم لے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے

---

[1] تزک والاجاہی، برہان خان ہانڈی مرتبہ گورنمنٹ پریس مدراس مطبوعہ ۱۹۵۵ء [2] محی الدولہ نامی کے فرزند اور امیر الملک عماد الدین محمد خان بہادر کے داماد تھے۔

نامی مدراس کے ایک کامیاب کلاسیکی مثنوی نگار ہیں جن کے یہاں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ فن کی کارفرمائی بھی بڑی خوبی اور سلیقہ سے ہوئی ہے۔

مجموعی طور پر نامی کی مثنویوں میں صنایع بدایع، تشبیہوں اور استعاروں کی موزونیت اور روزمرہ محاوروں کا دلچسپ اور برمحل استعمال قارئین کی توجہ چاہتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی نامی کا کلام ترقی کی منزلوں سے ہمکنار ہے البتہ کہیں کہیں قدیم اور متروک الفاظ کے استعمال کی وجہ سے کلام کے حسن میں قدرے خامی نظر آتی ہے تاہم نامی نے اپنی شاعری میں الفاظ و معنی کے آبدار موتی بکھیر دیے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں بھی ابتذال اور رکاکت پائی نہیں جاتی بلکہ ہر جگہ پاکیزگی اور نفاست کی مہک مشام دماغ کو تر و تازہ کرتی ہے نیز قارئین کو زبان و بیان کے ارتقائی منازل کا بھی کما حقہ اندازہ ہو جاتا ہے۔

غرض مجموعی طور پر نامی کی شاعری اردو کے کلاسیکی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھی جائے گی۔

کتابیات

حوالے دیے جا چکے ہیں، مزید جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے انکے نام حسب ذیل ہیں:
۱۔ مدراس میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ ۱۹۳۸ء حیدر آباد ۲۔ تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ ۱۹۷۵ء دہلی ۳۔ اردو مثنوی کا ارتقا۔ سید عقیل رضوی مطبوعہ ۱۹۹۱ء لکھنؤ ۴۔ مدراس میں اردو (سیمینار کے مقالوں کا مجموعہ) مرتبہ ڈاکٹر جلال عرفانی مطبوعہ ۱۹۹۲ء وانمباڑی ۵۔ مثنوی نوبہار عشق۔ مستقیم جنگ نامی مطبوعہ مدراس ۶۔ مدینۃ الانوار موسوم بہ وفات نبی مستقیم جنگ نامی۔ قلمی نسخہ ۷۔ گنج قدرت۔ مستقیم جنگ نامی۔ قلمی نسخہ۔

مولانا بدر الدین اصلاحی سے ایک ملاقات

از جناب رفیق احمد انصاری صاحب

مولانا بدر الدین اصلاحی ناظم مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ کی مردم خیز اور علم پرور سرزمین کے ایک مایہ ناز فرد تھے، وہ ۱۹ / جون ۱۹۹۶ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین۔

تین سال قبل شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج میں انٹرویو دینے کی غرض سے اعظم گڈھ جانے کا موقع ہاتھ آیا۔ عرصہ سے اس مرکز علم و ادب کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ انٹرویو سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دو دوستوں (طارق ایوب و انیس الرحمن) کے ساتھ مدرستہ الاصلاح پہونچا وہاں اساتذہ کرام سے ملا۔ اس کے بعد مولانا نجم الدین اصلاحی کے مستقر پہ حاضری دی جو کہ علامہ حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد رشید تھے مولانا سے کافی دیر تک گفتگو کر کے میں اپنی علمی پیاس بجھاتا رہا۔ اس کے بعد مولانا بدر الدین اصلاحی صاحب سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں اپنے دونوں دوستوں کے ہمراہ موضع بیناؤج جہاں مولانا کی رہائش تھی روانہ ہوا۔ مولانا طویل علالت کے باعث بستر پہ لیٹے ہوئے تھے۔ ہم لوگ سلام کر کے بغل میں پڑی ہوئی چارپائی پہ بیٹھ گئے۔ مولانا بستر سے اٹھنا چاہتے تھے میں نے چاہا کہ ان کو اٹھنے کے لیے سہارا دوں مگر انھوں نے بڑی بے تکلفی سے منع کر دیا۔ کہنے لگے رہنے دیجیے۔

"اس سے اعتماد مجروح ہوتا ہے"۔ یہ حکیمانہ جملہ میرے قلب و ذہن پہ ہمیشہ کے لیے نقش ہوگیا اور زندگی کے ہر لمحے میں مشعل راہ ثابت ہوا۔ مولانا نے بہت ہی پر تکلف ناشتہ کا انتظام کروایا اور جب تک ناشتہ ختم نہ ہوگیا بار بار کھانے کے لیے اصرار کرتے رہے۔ ہم لوگ تقریباً تین گھنٹے تک مولانا کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے۔ ہم کو ایک لمحہ کے لیے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ اس وقت مولانا کے ہاتھ میں "خطبات اصلاحی" کا ایک نسخہ تھا جس کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ میں نے مولانا امین احسن اصلاحی کے متعلق کچھ دریافت کیا۔ ان کا نام میری زبان پہ آیا ہی تھا کہ مولانا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے ہندوستان سے ان کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا وہ آج تک پُر نہیں کیا جا سکا ہے اور جو دھکا مجھے لگا ہے اس کے اظہار کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔ پھر کچھ بھرائی ہوئی آواز سے کہنے لگے میں مولانا مودودیؒ کو کبھی معاف نہیں کرونگا وہ انہیں اچک لے گئے۔ .... اس پہ کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی

تھوڑی دیر بعد میں نے ایک سوال کیا کہ مولانا یہ بتائیے کہ دور جدید میں نئے اذہان کے لیے قرآن کی کون سی تفسیر زیادہ مناسب رہے گی جو تریاق ثابت ہو۔ مولانا خاموش ہو گئے تھوڑی دیر بعد گویا ہوئے۔ کہنے لگے صاحبزادے تم نے مشکل سوال کر دیا ہے اور پھر خاموش ہو گئے۔

میں نے علامہ حمید الدین فراہیؒ کے متعلق گفتگو شروع کی تو معلوم ہوا کہ مولانا فکر فراہی کے رمز شناس ہیں جبکہ ان کی تحریر کو سمجھنا جوئے شیر لانا ہے۔ پھر میں نے مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کا نام لیا تو مولانا بے قابو ہو گئے۔

رقت طاری ہوئی، اپنے استاذ سے ایک شاگرد کی اس قدر والہانہ محبت میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔

مولانا بدرالدین ایک شریف النفس اور سلیم الطبع انسان تھے وہ نہایت ذہین صاحب علم اور عبقری شخص تھے، قرآن و حدیث، فقہ اور تاریخ پر اچھی نظر تھی، سادگی اور منکسر المزاجی میں بے مثال تھے۔ انکے سادہ طرز گفتگو سے انکے علم کا اندازہ نہیں ہوتا تھا مگر جب کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے گفتگو کرتے تو دلائل و براہین کا انبار لگا دیتے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے ؎

کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار   جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے

ان جیسے صاحب فضل و کمال، ذہین و ذی استعداد شخص کے لیے عظمت و شہرت حاصل کر لینا ناممکن نہ تھا مگر انہوں نے گوشہ گمنامی ہی میں پڑے رہنے کو پسند کیا، ممکن ہے استاذ امام علامہ فراہی کا یہ قطعہ انکے پیش نظر رہا ہو

گویند کہ گمنام بدن از جامی است   آوازہ و نام جو کہ خوش غیر جامی است

در پیش فراہی اے نکو اندیشاں   ایں جستن نام بد ترین بدنامی است

ترجمہ لوگوں کے خیال میں گمنام رہنا عبث کی بات ہے شہرت و ناموری تلاش کرو کہ آدمی کی خوش ایجابی یہی ہے۔ فراہی کے نزدیک تو اسے بھی خواہ ہو یہ ناموری کی خواہش بدترین بدنامی ہے"

مولانا کی شخصیت بہار آفریں اور اتنی دلآویز تھی کہ لوگ چند لمحے میں انکے گرویدہ ہو جاتے تھے وہ اپنی ظرافت و شگفتہ مزاجی اور رعنائی بیان سے لوگوں کو مسحور کر لیتے جب ہم لوگ مولانا کے پاس سے رخصت ہونے لگے تو وہ آبدیدہ ہو گئے، علالت و معذوری کے باوجود ایک چھڑی کے سہارے کافی دور تک بھیجنے آئے اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا اور دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا۔ مجھے مولانا سے گہری الفت و انسیت پیدا ہو گئی تھی جو انکی پرکشش سیرت اور مشفقانہ رویہ کی بنا پر تھی، مولانا کی بصیرت افروز اور مشفقانہ باتوں کو میں ان کی زندگی میں بار بار یاد کرتا رہا ہوں اور دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد تو مولانا کے ساتھ بیتے ہوئے لمحے نظروں کے سامنے گردش کرنے لگے ہیں ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اُردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

چند امتیازات و خصوصیات

جناب شیخ نذیر حسین صاحب۔ لاہور

ہندوستان کے متعدد ارباب علم انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لائیڈن) کی طرز پر اردو میں دائرہ معارف اسلامیہ کی تدوین و تالیف کے آرزومند تھے۔

چنانچہ پنجاب یونیورسٹی نے اس اہم اور مفید علمی کام کا بیڑا اٹھایا اور اس کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم و مغفور مقرر ہوئے۔ ان کی زیر نگرانی اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی تدوین کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ ابتدا میں انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لائیڈن) کا اردو ترجمہ ۱۹۵۹ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ عملے کی کمی کے باوجود پرانے اور نئے مقالات تقریباً ساٹھ ہزار صفحات کتابت یا ٹائپ کرائے گئے۔ پریس کی مشکلات کے باوجود جون ۱۹۵۹ء میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی پہلی جلد شایع ہوئی۔

اب یہ عظیم الشان علمی کارنامہ چوبیس جلدوں میں مکمل ہو گیا ہے۔ جو موضوعات مطبوعہ جلدوں میں شامل نہیں ہو سکے یا جن مشاہیر کا ذکر نہیں آسکا ان کے حالات کے لیے ایک علیحدہ جلد پیش نظر ہے، جس کا نام تکملہ ہو گا۔ ایک مختصر ایڈیشن جو ایک جلد پر مشتمل ہو گا، اس پر بھی کام ہو رہا ہے۔ مزید براں انڈکس (اشاریہ)

کی تدوین و تالیف بھی زیر تجویز ہے جو ایک علیحدہ جلد پر مشتمل ہوگا۔

غرضیکہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی ترتیب و اشاعت پنجاب یونیورسٹی کا ایک منفرد علمی کارنامہ ہے جس کی مثال پیش کرنے سے تمام اسلامی ممالک قاصر ہیں۔

ترکیہ اور مصر سے بھی دائرہ معارف اسلامیہ کی چھ سات جلدیں شایع ہوئی ہیں لیکن وہ خالی ترجمہ پر مشتمل ہیں۔ ان میں کوئی ترمیم یا خاطر خواہ حذف و اضافہ نہیں کیا گیا۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی چند امتیازی خصوصیات، جن کی وجہ سے اس تصنیف کو انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پر فوقیت اور ایک جداگانہ اور مستقل حیثیت حاصل ہوگئی ہے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اصل مقالات میں سنین، واقعات، حقائق اور ماخذ میں ضروری تصحیح کی گئی ہے۔

۲۔ پاکستان اور اسلامی ہند سے متعلق اہم موضوعات پر نئے مقالات لکھوائے گئے ہیں اور برصغیر کی ممتاز شخصیات، علماء، صلحا، ادبا اور شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔

۳۔ اسلامی عقائد، نظریات اور عبادات پر نئے مضامین عملہ ادارت نے خود لکھے ہیں یا پاکستان کے مشاہیر اہل علم سے لکھوائے گئے ہیں۔ اس بارے میں ہمیں مفتی محمد شفیع مرحوم (کراچی) اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) کی قلمی معاونت حاصل رہی ہے۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور آپ کی حیات طیبہ پر ایک مبسوط مقالہ علیحدہ جلد میں شامل کیا گیا ہے۔

۵۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں کے مطالب و مضامین پر علیحدہ علیحدہ مقالات لکھوائے گئے ہیں۔

۶۔ اسلامی اور پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب پر جامع مقالات کا اضافہ کیا گیا ہے

۷۔ اسلامی ادبیات (عربی، فارسی، اردو اور پنجابی) میں نعت گوئی کے موضوع پر ایک سلسلہ مضامین لکھوایا گیا ہے۔

۸۔ اسلامی ممالک (انڈونیشیا سے لے کر موریطانیہ تک) کے موجودہ حالات اور اسلامی تحریکات کو خاص جگہ دی گئی ہے۔

۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم سابق رئیس ادارہ نے اپنے مقالہ المتعلم والمعلم میں اسلام کے اصول تعلیم و تربیت پر حکیمانہ گفتگو کی ہے اور یہ خاصے کی چیز ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے تاثرات میں لکھا ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ جس پیمانے اور جس بلند ہمتی اور دیدہ وری و دیدہ ریزی سے یہ کام (جو عالم اسلام کے ذمہ عرصہ دراز سے قرض اور فرض تھا) یہاں انجام پا رہا ہے۔ اس کی نظیر عرب ملکوں میں (جن میں علمی حیثیت سے مصر سب سے آگے ہے جو اس کام کی تکمیل کے سب سے زیادہ مستحق تھے) نہیں پائی جاتی۔"

میں حکومت پاکستان، پنجاب یونیورسٹی اور دائرہ معارف اسلامیہ کو اس پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دل سے دعا کرتا ہوں کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ کر مسلمانوں کے لیے باعث سرخروئی اور تمام دنیا کے اہل علم اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے تحفہ بے بہا ثابت ہو۔

امید ہے کہ یہ چند گذارشات بہت سے لوگوں کے لیے معلومات افزا ثابت ہوں گی۔

اخبار علمیہ

پاکستان کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی دعوۃ اکیڈمی کا انگریزی ترجمان رسالہ دعوہ ہائی لائٹس پابندی سے معارف کو موصول ہوتا ہے، ڈاکٹر انیس احمد اور میاں محمد افضل کے زیر ادارت اس میں قرآن و حدیث، تاریخ اسلام اور عبادات و معاملات کے موضوعات پر مختصر لیکن مفید مضامین ہوتے ہیں۔ عالم اسلام کے ملکوں کے بارے میں جدید ترین معلومات کے علاوہ اخبار اسلامیہ ...... خاص طور پر قابل ذکر ہیں مثلاً اس کے تازہ شماروں سے معلوم ہوا کہ قاہرہ سے قریب پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پر پندرہ ہزار کی آبادی والا نائی نامی ایک گاؤں ہے جو اب اس لحاظ سے ساری دنیا میں ممتاز و نمایاں ہے کہ اس کی مکمل آبادی حفظ قرآن مجید کی دولت سے مالا مال ہوئی ہے اور بجا طور پر اب اسے قریہ قرآنی کا باعزت خطاب ملا ہے، برسوں پہلے ۱۹۴۰ء میں حفظ قرآن کا یہاں ایک مرکز قائم ہوا تھا اور وہی اس سعادت کی وجہ خاص بنا۔ قرآنیات سے متعلق یہ خبر بھی ملی کہ طہران میں حال ہی میں قرآن مجید کے ساٹھ زبانوں کے تراجم کی ایک شاندار نمائش ہوئی، حکومت ایران کے ایک ادارہ نے اس کا اہتمام کیا جس نے خود ترکی، فرانسیسی، کردی، انگریزی اور روسی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے۔ نمائش کی ایک کشش قرآن شریف کے

نادر مخطوطے اور قدیم مطبوعہ نسخے بھی تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کناڈا میں قرآن مجید کے متعلق ایک انسائیکلوپیڈیا کا منصوبہ زیر عمل ہے، ٹورانٹو یونیورسٹی کے پروفیسر جین میکالیو سے ہالینڈ کے ایک ناشر آئی، جے بریل نے اس دائرۃ المعارف کی فرمائش کی توقع ہے کہ ۲۰۰۰ء تک کناڈا، فرانس اور امریکا کے مستشرقین اور عالم اسلام کے ماہرین علوم القرآن کے تعاون سے یہ انسائیکلوپیڈیا شایع ہو جائے گی جو شاید انگریزی زبان میں اپنی نوعیت میں منفرد ہوگی۔ ایک اور خبر یہ بھی ہے کہ غرناطہ کے ایک کلیسا میں قرآن مجید کا نہایت نادر نسخہ دستیاب ہوا ہے جو اندلس کے عہد اسلامی کی یادگار ہے۔ یہ ۱۰۸ صفحات میں اور اندلسی خط میں ہے۔

ترکی کے فعال علمی ادارہ ریسرچ سنٹر فار اسلامک ہسٹری، آرٹ اینڈ کلچر (IRCICA) کی علمی کارگزاریوں اور مطبوعات کا ذکر ان کالموں میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے، یہ ادارہ موتمر عالم اسلام کے تعاون سے ۱۹۸۰ء میں استنبول میں قائم ہوا، مقصد یہ تھا کہ اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کی عظمت و برکت سے دوسروں اور خود مسلمانوں کو روشناس کرایا جائے، چنانچہ علوم قرآنی اور تاریخ اسلامی کے علاوہ فن تعمیر، صنعت و حرفت، خطاطی وغیرہ موضوعات پر اس نے قریباً پچاس بلند پایہ کتابیں شایع کیں۔ ترکی کے علاوہ اس نے بوسنیا کی اسلامی تاریخ پر بیش بہا معلومات فراہم کیے، عہد خلافت عثمانیہ کے آثار و اجداد کی تحقیق و اشاعت بھی اس کا خاص کارنامہ ہے گذشتہ دنوں اس ادارہ کے پندرہ سال مکمل ہوئے تو ایک شاندار تقریب

ہوئی جس کی صدارت ترکی کے صدر سلیمان ڈیمیرل نے کی اور عالم اسلام کے متعدد سربراہوں اور اداروں نے پیغامات تحسین بھیجے، دعا ہے کہ ادارہ ترقی و کامرانی کی اور منزلیں سر کرے، اس کے تازہ خبرنامہ سے اس کی بعض جدید مطبوعات کا علم بھی ہوا جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

آثار قدیمہ اور تمدنی و ثقافتی ورثہ کا تحفظ دور جدید کا اہم مسئلہ و مشغلہ ہے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے، ہندوستان میں یہ حکومت کے اہم منصوبوں میں شامل ہے اس کے باوجود گذشتہ دنوں ایک خبر سے ہندوستانی حکومت و انتظامیہ کی غیر ذمہ داری و بے حسی ظاہر ہو کر رہی، ٹائمز آف انڈیا کی ایک رپورٹ کے مطابق دلی کی حکومت نے پرانی دلی میں ایک عوامی بیت الخلا کی تعمیر کے لیے 'موزوں جگہ'، کی شکل میں خاقانی ہند ذوق دہلوی کے مزار کا انتخاب کیا، اس بد ذوقی سے آزردہ ہو کر دارالحکومت کے وکیلوں اور قانون دانوں کے ایک طبقہ نے عدلیہ سے فریاد کی، جسٹس کلدیپ سنگھ کی سربراہی میں ججوں نے انصاف کیا اور حکم دیا کہ غالب اور ذوق کے مزاروں کو قومی یادگار کا درجہ دیا جائے اور فوری طور پر ان کے تحفظ کے اقدامات کیے جائیں، کلدیپ سنگھ نے تلخ لہجہ میں کہا کہ "حیف صد حیف کہ غالب و ذوق جیسے شعراء سے جنھوں نے ملک کو عظمت بخشی اس قسم کا سلوک کیا جائے، غالب کا مزار اگرچہ کسی حد تک مقبرہ کی شکل میں ہے لیکن ملک کے لیے زیبا یہی ہے کہ وہاں شایان شان یادگار تعمیر کی جائے اسی طرح ذوق کا مقبرہ بھی تعمیر ہو کہ یہ قوم کی جانب سے کم سے کم تلافی کی شکل ہوگی"، اخبار پانیر کے مبصر سمیر کول نے عدالت کے اس

تبصرہ کے متعلق حسرت سے لکھا کہ "یہ موثر الفاظ کسی نامور مذہبی شخصیت کے نہیں، قدیم وراثت کے نام نہاد رکھوالوں کے بھی نہیں، کسی سماجی مصلح، معزز شہر، امیر و وزیر نے بھی لب نہیں کھولے، یہ فریضہ ایوان عدل نے ہی انجام دیا"۔

تاجداران سخن غالب و ذوق کے ذکر میں آخری مغل تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر کی یاد ناگزیر ہے، کوئے یار میں دو گز زمین کی حسرت لیے وہ رنگون (اب ینگون) میں مدفون ہوئے، چند ماہ ہوئے ٹائمز آف انڈیا ہی کی ایک رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ ۱۸۹۲ء تک برطانوی حکومت کے حکم کے مطابق مزار پر جانے کی اجازت نہیں تھی، مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ اس کے اردگرد مامور تھا، بعد میں وہاں ایک معمولی سا قبہ تعمیر کیا گیا، ۱۹۴۴ء میں سبھاش چندر بوس نے وہاں آزاد ہند فوج کی ایک پریڈ کی اور بہادر شاہ ظفر کو تحریک آزادی ہند کے پہلے قائد کی حیثیت سے یاد کیا، آزادی کے بعد اگرچہ بعض ہندوستانی وزراء نے مزار پر حاضری دی لیکن انھوں نے اسکی خستہ حالی پر نظر نہیں کی، اندرا گاندھی نے البتہ اس کی تعمیر نو اور آرائش کا حکم دیا لیکن ہندوستانی سفارت خانہ نے اس کو نظر انداز کر دیا، اس طرح برما کی حکومت سے شکوہ نہیں، بہرحال وہ غیر ہے، اصل گلہ تو ہندوستانی ارباب حکومت و انتظامیہ سے ہے، خدا کرے اب اس قومی یادگار کی زبوں حالی پر دلی کے باضمیر قانون دانوں کی طرح اوروں کا ضمیر بیدار ہو۔

قومی یادگاروں اور آثار قدیمہ کی نگرانی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ذمہ داری ہے، ۱۸۶۱ء میں جب جنرل الکزنڈر کننگھم نے اسے قائم کیا تھا، تب یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کا دائرہ کار اس قدر وسیع ہوگا اس وقت اس کی نگرانی میں تقریباً ۳۶۰۰ قومی یادگاریں ہیں، آثار مدفونہ کی تلاش اور کھدائی بھی اسی کے ذمہ ہے اور اب اس کے تجربات سے افغانستان، انگولا، بحرین، بھوٹان، کمبوڈیا، مصر اور نیپال بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن اس کو عملہ کی قلت اور سرمایہ کی کمی کی شکایت ہے، اس کے ایک سابق ڈائریکٹر جنرل نے آثار قدیمہ کی زبوں حالی کی شکایت کے جواب میں یہ کہا تھا کہ "مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان کا ورثہ بہت زیادہ ہے"، بہرحال اب یہ ادارہ حکومت سے الگ نجی اداروں سے امداد و تعاون حاصل کرنے کی فکر میں ہے، سانچی، نالندا اور بودھ گیا کے عجائب خانوں کے لیے اس نے بیرونی اداروں سے مالی تعاون حاصل بھی کر لیا ہے۔

برطانیہ کے معالجہ دماغی کے ایک ماہر ڈاکٹر فیلکس پوسٹ نے برطانیہ اور امریکا کے سوادیبوں، شاعروں اور ڈرامہ نویسوں کی سوانح عمریوں کی روشنی میں انکی دماغی حالت وکیفیت کا جائزہ لیا، شاعروں کے متعلق عام خیال ہے کہ وہ افسردگی، بددلی اور احساس محرومی کا شکار ہوکر جام و مینا کا سہارا لیتے ہیں اور یک گونہ بے خودی کی تلاش میں ذہنی بے اعتدالی بلکہ امراض دماغی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ ان سے زیادہ ادیب، ناول نگار، ڈرامہ نویس اور سائنس داں و سیاستداں امراض دماغی کے شکار اور شراب نوشی میں بھی شاعروں سے آگے ہیں یعنی شاعروں کے ۳۱ فیصد کے مقابلہ وہ ۵۴ فیصد ہیں، بہرحال ثابت ہوا کہ اصحاب قلم اور دماغی امراض کا رشتہ خاصا مضبوط ہے یعنی ڈرامہ نویسوں میں ۸۸، ناول نگاروں میں ۸۰ تو شاعروں میں ۶۰ فیصد ہیں۔

ع۔ ص۔

تین خطوط

"ناظرین کو اخباروں سے معلوم ہوا ہوگا کہ ۱۵ اگست ۱۹۹۵ء کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے راقم کو ایوارڈ دیے جانے کا اعلان ہوا تھا، اس وقت بہت سے بزرگوں اور دوستوں نے مبارکباد کے خطوط لکھے تھے، جن کی اشاعت گو دارالمصنفین کے مفاد میں تھی تاہم اس میں خودستائی کا پہلو تھا اس لیے ان کو شایع کرنے کے لیے طبیعت آمادہ نہیں ہوئی۔

اس سال ۱۰ اگست ۱۹۹۶ء کو صدر محترم نے سند اعزاز مرحمت فرمائی اس پر بھی بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں، بعض وجوہ سے صرف تین خط شایع کیے جارہے ہیں"۔

(ض)

اسمٰعیل اسٹریٹ کلکتہ

۱۶ اگست ۹۶ء

گرامی قدر مولانا ضیاء الدین اصلاحی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کلکتہ کے روزنامہ "اخبار مشرق" مورخہ ۱۲ اگست ۹۶ء کے شمارے میں یہ مژدۂ جانفزا پڑھ کر قلبی مسرت ہوئی کہ صدر جمہوریہ ہند نے عربی زبان و ادب کی گرانقدر خدمات کے صلے میں آپ کو صدارتی انعام سے نوازا ہے اور سند فضیلت بھی عطا کی ہے۔ دبستان شبلی کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تصنیفی کارناموں کی قدر شناسی کے طور پر

غالباً حضرت مولانا صباح الدین عبدالرحمن کے بعد آپ دوسرے اسکالر ہیں جن کو
یہ اعزاز بخشا گیا ہے [1]

آپ کی قبائے علمی میں اس زریں تکمہ کے اضافے پر فارسی کے تہنیتی اشعار
پیش خدمت ہیں ؎

صبا بہ تہنیت پیر مے فروش آمد
کہ موسم طرب عیش وناؤ و نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کشا
درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد

کلکتہ میں آپ کی آمد پر متعدد علمی صحبتوں کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ امید ہے
کہ بین الاقوامی شہرت کے مالک پروفیسر ڈاکٹر مقبول احمد کے علاج سے وجع
مفاصل کی تکلیف دور ہو گئی ہوگی۔

آپ کا نیازمند
محمد اسحاق

گورکھپور
۱۵ر اگست ۱۹۹۶ء

محترم و معظم سلام مسنون

آپ کے اعزاز کی خبر پا کر میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے
ایک کرمفرما کو اپنی نوازشوں سے نوازا۔ کیونکہ میرا یقین کامل ہے کہ اس دنیا میں انسان جو کچھ بھی
حاصل کرتا ہے وہ اس قادر مطلق کی رہین منت ہے۔ بعدہٗ آپ کی خدمت میں تہ دل سے
ہدیہ تبریک پیش کر رہا ہوں، علمی و ادبی میدان میں آپ نے جس خاموشی سے

[1] پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کو یہ اعزاز ملا تھا (ض)

مساعی جمیلہ کی ہیں اس کا ایک جزوی عوض اللہ نے آپ کو صدر جمہوریہ
ہند کے ہاتھوں سے دلا دیا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں سے
آپ کو بھرپور نوازتا رہے، آپ کے حلقۂ احباب میں شامل ہونے کے
سبب مجھے آپ کے اعزاز کی خبر سے نہ صرف طمانیت قلب ہوئی بلکہ
فخر بھی محسوس ہوا۔

خیر اندیش : محمد حامد علی

قومی آواز
لکھنؤ

برادرم سلام مسنون !

عربی زبان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ
ملنے پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔

یقین کیجیے قومی آواز میں یہ خبر پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی جیسے یہ ایوارڈ
مجھے ملا ہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو مستقبل میں مزید
انعام و اکرام سے نوازے آمین۔ آپ سے ملاقات کرنے کو بہت دل
چاہتا ہے، دیکھئے میری یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔

عامر سلمہ کو دعائیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ جواب کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

آپ کا بھائی
شاہ خلیل احمد ردولوی
سب ایڈیٹر قومی آواز

وفیات

آہ! پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

از ضیاء الدین اصلاحی

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے انتقال کی خبر یکم اگست کو ۱۲ بجے شب میں ملی تو یقین نہیں ہوا۔ علی الصباح جناب عبداللطیف اعظمی کو فون کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ حادثہ جاں کاہ ۳۰/ جولائی کی شب میں پیش آیا اور ۳۱/ کو دوپہر بعد تدفین ہوئی۔ میرے لئے یہ خبر ناقابل برداشت تھی۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ان کے دونوں صاحبزادوں کو خطوط لکھے، اس پر بھی تاب لائے نہ بنی تو ۸/ اگست کو دہلی ان کے دولت کدہ پر تعزیت کے لئے حاضر ہوا۔ لیکن اب بھی تسکین دل محزوں نہیں ہو رہی ہے اور بے چینی اور اضطراب کا وہی عالم ہے

مجھ سے پوچھو نہ مزاج دل ناشاد ابھی
میرے نغموں میں ہے کچھ تلخی فریاد ابھی

ابھی ۱۸/ جولائی کو مجلس تحقیقات و نشریات لکھنو کے جلسے میں ان سے ملاقات ہوئی تھی تو میں نے عرض کی تھی کہ اعظم گڈھ تشریف لے چلیں۔ پہلے تو حسب عادت مسکرائے پھر کہا، ۲۰/ کو دہلی واپسی کا ریزرویشن کراچکا ہوں، میں ڈھائی بجے دن میں ان سے رخصت ہونے لگا تو یہ کہہ کر مجھے روکنا چاہا کہ "ارے بڑی سخت دھوپ ہے"۔

ٹھہر بھی جا در ساقی پہ دو گھڑی کے لئے
تمام عمر پڑی ہے روا روی کے لئے

مگر میں یہ اشارہ غیبی نہ سمجھ سکا کہ چند روز بعد کبھی نہ واپس ہونے والے سفر سے ان کا رزرویشن ہو چکا ہے اور اپنی دھن میں روانہ ہو گیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ع انہیں دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ۔ اور اس عالم ناسوت میں یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد ان کا روئے روشن اور رخ زیبا دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ اور صرف حسرت ہی حسرت رہ جائے گی۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

وہ ۲۵/ مئی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن اعظم گڈھ سے متصل ضلع فیض آباد کا مشہور صنعتی قصبہ ٹانڈہ تھا، جو علمی و تعلیمی حیثیت سے بھی امتیاز رکھتا تھا۔ یہاں کی خانقاہوں سے چلنے والے علم و عرفان اور رشد و ہدایت کے جھونکے اعظم گڈھ کے مغربی قصبوں اور دیہاتوں میں بھی پہونچ رہے تھے۔ ٹانڈہ میں شیوخ و سادات کے بعض خاندان آباد تھے۔ جو علمی، دینی اور دنیاوی وجاہت کے مالک تھے۔ ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا خاندانی تعلق فاروقی شیوخ سے تھا جس کی

قرابت سادات کے خاندانوں میں بھی تھی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے حقیقی بھتیجے مولانا وحید احمد صاحب کی صاحبزادی ان کے عقد میں تھیں، ان کے خاندان میں دین داری تھی۔ خود فاروقی صاحب میں بھی دین داری رچ بس گئی تھی۔ جس میں عمر کے ساتھ برابر ترقی ہوتی رہی۔ وہ صوم و صلاۃ اور اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ جماعت سے نماز پڑھتے اور صف اول میں شامل ہوتے، تہجد اور شب خیزی کے عادی تھے۔ صبح سویرے قرآن مجید کی تلاوت معمول میں داخل تھی۔ رمضان میں تراویح میں قرآن مجید سننے کا التزام تھا۔ ان کے خاندان کا دینی تعلق تو حضرت مدنیؒ اور ان کے خاندان سے رہا ہوگا مگر وہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ سے بیعت تھے اور خوش تھے کہ

ع دامن پکڑ لیا ہے شب دراز کا

تعلیم علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی۔ اس وقت ان کے معاشی حالات بہتر نہ تھے، کوئی اور ہوتا تو پڑھنا لکھنا چھوڑ دیتا۔ مگر وہ اولوالعزم، حوصلہ مند، محنتی اور جفاکش تھے، مشقتیں اور صعوبتیں جھیل کر اور سرد و گرم حالات کا مقابلہ کر کے تعلیم مکمل کی۔

مجھے ان کے نام سے واقفیت اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہوئی۔ اس وقت وہ مدینہ بجنور کے شعبہ ادارت سے منسلک تھے۔ اسی زمانے میں میری مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی تھی اور بعض مضامین مدینہ اور غنچہ میں بھی شائع ہوئے تھے۔ صاحب سلامت کی نوبت ۱۹۶۵ء میں آئی جب وہ دار المصنفین۔ شبلی اکیڈمی کی گولڈن جبلی میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس میں انہوں نے اپنا مقالہ بھی پڑھا تھا۔ اس کے بعد دار المصنفین سے ان کے روابط بڑھے اور غالباً ۶۷ء یا ۶۸ء میں وہ اس کے کتب خانے سے استفادے کے لئے یہاں آئے تو تقریباً ایک ماہ قیام پذیر رہے۔ اس عرصہ میں مجھے ان کے علمی شغف اور مطالعہ میں استغراق و انہماک کا اندازہ ہوا، شام کو چائے پر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم کے ساتھ ان کی پر لطف صحبت رہتی جس میں علمی، ادبی اور سیاسی مسائل پر دلچسپ باتیں ہوتیں۔ میں بھی ان صحبتوں میں شریک رہتا اور علمی و ادبی نکتوں سے لطف اندوز ہوتا۔

۱۹۷۷ء میں وہ دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہوئے تو اس کے مسائل و معاملات سے انہیں ایسی دلچسپی ہوئی کہ وہ جلد ہی اس کی مجلس عاملہ کے بھی ممبر ہو گئے اور جو ذیلی کمیٹیاں تشکیل پاتیں ان کے ایک ممبر وہ بھی ضرور ہوتے تھے۔ بڑی پابندی سے دار المصنفین کے جلسوں میں تشریف لاتے اور اس کو برابر یاد رکھتے، اعظم گڈھ کا کوئی آدمی ان کو مل جاتا تو اس کے اور اس کے کارکنوں کے بارے میں ضرور دریافت کرتے۔ وہ کسی حال میں ہوتے دار المصنفین کا خیال ان کو ضرور رہتا

ع قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد

راقم الحروف کو ان کے مفید مشوروں اور وسیع تجربوں سے بڑی مدد اور رہنمائی ملتی،
دارالمصنفین کے سرد و گرم حالات اور نازک اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں بڑی دماغ سوزی سے
کام لیتے، اب ایسا مخلص اور ہمدرد آدمی کہاں ملے گا؟ ادھر کئی برسوں سے ان کی حیثیت
دارالمصنفین کے علمی و انتظامی مشیر کی ہوگئی تھی، سال میں ایک یا دو بار وہ ضرور تشریف لاتے، ماہ
ڈیڑھ ماہ قیام کرتے، اپنے علمی کاموں کے علاوہ دارالمصنفین کے رفقاء و کارکنوں کی رہبری بھی کرتے اور
یہاں کا چھوٹا بڑا ہر کام شوق و دلچسپی سے انجام دیتے، اتفاق سے بابری مسجد کی شہادت کے زمانے
میں وہ یہیں موجود تھے، عجیب خوف و دہشت کا ماحول تھا، ان کی وجہ سے بڑی تقویت تھی، میں نے
دسمبر ۹۲ء کے معارف کا اداریہ لکھا تو کتابت کے لیے دینے سے پہلے ان کو اور رفقا کو دکھلایا، انھوں
نے دو ایک جگہ حذف و ترمیم کا مشورہ دیا، مسجد کے سلسلے میں کانگریس کے رویے کے بارے میں
میرے نوک قلم پر ایک شعر آگیا تھا ؎

مری میت پہ اب آیا ہے ظالم بال بکھرائے — کہو یہ شکل جیتے جی دکھادیتا تو کیا ہوتا

اس پر وہ پھڑک اٹھے اور دریافت کیا کس کا شعر ہے، مگر میں بتا نہ سکا۔

ان کی فراغت، علمی ترقی اور ادبی فتوحات کا دور اس وقت شروع ہوا جب وہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوئے، یہاں وہ جامعہ کالج کے پرنسپل، فیکلٹی آف ہومینٹیز اینڈ لینگویجز کے
ڈین، شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر اور
قائم مقام وائس چانسلر رہے، روس کا سفر کیا، رسالہ جامعہ کا دوبارہ اجرا ہوا تو عبداللطیف اعظمی
صاحب کے تعاون سے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کے متعدد خاص نمبر شائع کئے جو
مستقل تصنیفات سے بڑھ کر تھے، ۶۹ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین کی سرکردگی میں "اسلام اینڈ دی
ماڈرن ایج سوسائٹی" کا قیام عمل میں آیا، اس کی طرف سے عابد صاحب کی ادارت میں اردو اور
انگریزی دونوں زبانوں میں "اسلام اور عصر جدید" اور "اسلام اینڈ ماڈرن ایج" کے نام سے سہ ماہی
علمی رسالے نکلے، عابد صاحب کی وفات کے بعد ان دونوں رسالوں کی ادارت بھی ضیاء الحسن فاروقی
صاحب کو سپرد ہوئی، اپنے شعبہ کی سربراہی کے ساتھ تین تین رسالوں کی ادارت کا بار اٹھالینا اور
اچھی طرح نباہ لینا ان کے جیسے غیر معمولی شخص ہی کا کام ہوسکتا ہے۔

؏ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اپنے شعبہ کی جانب سے انھوں نے بڑے پیمانے پر کئی سیمینار بھی کرائے، فقہ اسلامی کی

تشکیل جدید" کے عنوان سے جو سیمینار ہوا تھا اس کے مضامین کا مجموعہ انھوں نے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔
تصنیف و تالیف ان کا خاص ذوق تھا، اردو اور انگریزی دونوں میں تصنیفات یادگار
چھوڑی ہیں، فارسی شعر و ادب کا عمدہ مذاق تھا، اور اردو کے بہت اچھے مشاق اور صاحب فکر
مصنفین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اسلامی علوم، عہد حاضر کی اسلامی سیاست اور اس دور کے ان مسلم رہنماؤں سے
فاروقی صاحب کو خاص دلچسپی تھی جنھوں نے مفید دینی، اصلاحی اور تعلیمی خدمات انجام دیں اور
جن کا مسلمانوں کی موجودہ قومی و سیاسی بیداری میں خاص حصہ رہا ہے، مذہب، تصوف اور قومی
تحریک سے ان کی دلچسپی مولانا مدنیؒ کے اثر کا نتیجہ رہی ہوگی، لیکن علمی و فکری حیثیت سے وہ
مولانا آزاد کے زیادہ قریب رہے، ان کے دینی و سیاسی تصورات کا رنگ ان پر آخر تک چھایا رہا،
دو قومی نظریے اور بعض مسلم جماعتوں کے وہ ہمیشہ خلاف رہے اور اپنے مضامین اور تحریروں میں
ان کے طرز فکر کی کجی و خامی کی نشاندہی بھی کرتے، اس سلسلہ میں ان کی کتاب "اسلام اور بدلتی
دنیا" بڑی اہم ہے جو ان اداریوں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے سہ ماہی اسلام و عصر جدید
(اردو) کے لئے لکھے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر حالات کی نزاکتوں اور دین کے
تقاضوں پر یکساں ہے، اس میں انھوں نے عالم اسلام کے واقعات اور مسلمانوں کو درپیش دینی،
سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کے نتائج و عواقب کا جائزہ لیا ہے اور اسلامی تعلیمات
کی روشنی میں عقل و تدبر سے کام لے کر انہیں حل کرنے کی دعوت دی ہے، انھوں نے خاص
طور پر بعض دینی جماعتوں اور ہندوستان اور اسلامی ملکوں کے بعض مصلحین کی علمی، فکری، دعوتی
اور اصلاحی خدمات پر اس طرح بحث و تبصرہ کیا ہے کہ ان کی خوبیوں اور ان کے مفید پہلوؤں کے
ساتھ ان کی خامیاں اور کوتاہیاں بھی سامنے آگئی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان اور دنیائے اسلام
کے بعض ملکوں میں اسلامی بیداری کے آثار اور اسلام کو مضبوط و مستحکم کرنے کی خواہش تو نمایاں
ہے مگر ان میں معاشرتی و معاشی اصلاح اور سچی اسلامی زندگی کے قیام کے بنیادی کام کو نظر انداز کر
کے سیاسی طاقت اور حکومتی اقتدار حاصل کر کے اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔

"افکار و اشخاص" بھی ان کی اسی طرح کی کتاب ہے، یہ بھی مضامین کا مجموعہ ہے اس میں
سرسید، مولانا شبلی، مولانا آزاد، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، رشید رضا، ضیاء گوکلپ اور لطف
اللہ کے اصلاحی افکار و خیالات کا تجزیہ کیا گیا ہے، وہ کچھ عرصہ کے لئے پروفیسر ڈاکٹر ذاکر حسین چیئر

بھی رہے اور ذاکر صاحب کی مبسوط سوانح عمری لکھنے کا کام ان کے سپرد ہوا۔ یہ کام ان کے ذوق اور دلچسپی کا تھا لیکن ظاہر ہے ذاکر صاحب جیسی ہمہ گیر اور پہلودار شخصیت پر محدود وقت میں کتاب لکھنا آسان نہیں تھا مگر انہوں نے بڑی تلاش و جستجو اور محنت شاق سے "شہید جستجو" کے نام سے ان کی ایک ضخیم اور مکمل داستانِ زندگی مرتب کردی۔ اس کی تیاری میں انہوں نے جو غیر معمولی جانفشانی کی ہے اس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے ہوتا ہے۔

"ذاکر صاحب کی اس بایوگرفی کے تیار کرنے میں نہ معلوم کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے، کتابیں، مضامین، ریکارڈ کئے ہوئے ابتدائیہ، انٹرویوز، ذاکر صاحب اور دوسروں کے خطوط، پرائیویٹ پیپرز اور خود ذاکر صاحب کی وہ تحریریں جن تک میری رسائی ہو سکی، بیسیوں اشخاص سے ملاقاتیں اور نہ جانے کیا کیا"۔

بایوگرفی کے موجودہ معیار اور تحقیق کے نئے طریقوں کو مد نظر رکھ کر انہوں نے ذاکر صاحب کی جو وقیع اور معتبر لائف مرتب کی ہے اس سے بہتر ممکن نہیں تھی، یہ آئندہ کام کرنے والوں کے لئے مستند ماخذ کا کام دے گی۔

شہید جستجو کی ترتیب کے درمیان انہیں ذاکر صاحب کی ایک بیاض دستیاب ہوئی جس میں ان کے پسندیدہ فارسی اشعار درج تھے، "نگار معنی" کے نام سے اس کا ایک اچھا انتخاب مرتب کر کے اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کیا، اس سے دونوں حضرات کے فارسی شعر و ادب کے اچھے ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ۱۹۸۷ء میں انہوں نے ذاکر صاحب کی ۹۰ ویں سال گرہ کے موقع پر "ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنی میں" مرتب کر کے شائع کیا جو ذاکر صاحب کی بعض اہم انگریزی تحریروں کے اردو ترجموں اور بعض کم یاب اردو تحریروں اور تقریروں اور چند نہایت اہم غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے نام کے خطوط کا واقعاتی پس منظر بیان کرنے کے لئے مرتب نے "الفت موج و کنار" کے عنوان سے دلچسپ اور پر مغز ابتدائیہ لکھا ہے۔

اسی طرح کی ایک کتاب "مجیب صاحب کے احوال و افکار" کے نام سے مجیب صاحب کی ۸۰ ویں سال گرہ کے موقع پر شہاب الدین انصاری اور جناب عبداللطیف اعظمی کے اشتراک سے مرتب کی تھی جس کے پہلے حصہ "احوال" میں ان کے اور دوسروں کے مضامین ہیں اور دوسرا حصہ "افکار" خود مجیب صاحب کی منتخب تحریروں کا مجموعہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کو ذہنی ہم آہنگی بھی تھی، اور غیر معمولی عقیدت بھی۔ مولانا پر انہوں نے کئی فاضلانہ مقالے لکھے، آج کل وہ انگریزی میں مولانا کی سیاسی سوانح پر کام کر رہے تھے، جس کی پہلی جلد پریس کے حوالے کر چکے تھے اور دوسری جلد کی تالیف میں ہمہ تن مشغول تھے۔

تصوف کا ذوق انہیں وراثتاً ملا تھا، اس سے علمی و عملی وابستگی تھی، اسی مناسبت سے انہوں نے طبقۂ صوفیہ کے سرخیل حضرت جنید بغدادیؒ کی شخصیت و تصوف پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، اس کے پہلے حصہ میں ان کے حالات، تصوف و شخصیت، نظریہ توحید و صحو اور تصنیفات پر بحث کی ہے، اور جنید بغدادی کی مشہور کتاب "معالی الہمم" میں مذکور علماء و صلحا کا حال لکھا ہے۔ اور دوسرا حصہ اس کتاب کے اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔

صوفیانہ مشرب سے دلچسپی کی بنا پر انہوں نے فوائد الفواد کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ انگریزی میں کئی اور کتابیں بھی لکھیں۔ تعلیم کے موضوع پر بھی ان کی کتابیں ہیں۔

جس طرح ان کی شکل و صورت پاکیزہ، پرکشش اور چہرہ پرنور تھا، اسی طرح ان کے دل اور ان کی سیرت و کردار میں بھی پاکیزگی، دلکشی اور جاذبیت تھی، مہر و محبت، حلم و انکسار، رحم و مروت، اخلاص و نیک طینتی اور اعتدال و سلامت روی ان کی سیرت و شخصیت کا خاص جوہر تھا، بڑے مرنجاں مرنج تھے، ہر شخص سے بڑی میٹھی اور نرم گفتگو کرتے، شکوہ، شکایت، غیبت، بدگوئی اور خودستائی سے پرہیز کرتے، چھوٹے بڑے، ادنا و اعلا ہر ایک سے تعلق رکھتے اور سب سے بشاشت اور تپاک سے ملتے۔ دارالمصنفین کے ایک ایک آدمی سے گھل مل گئے تھے، سب کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے اور اظہار ہمدردی کرتے۔ وقت کے بڑے پابند تھے، فضول کاموں اور خواہ مخواہ کی بحث و تکرار میں وقت ضائع نہ کرتے، ہر قسم کی دلچسپیاں ترک کر دی تھیں اور صرف مفید اور بامقصد کاموں میں وقت صرف کرتے۔

قاعدہ و ضابطہ کے نہایت پابند تھے، اصول و قانون شکنی کو سخت ناپسند کرتے۔ جامعہ میں وہ بڑے ذمہ دارانہ عہدوں پر متمکن رہے، عزل و نصب کے اختیارات بھی ان کو حاصل تھے، اس کی اور اصول و ضابطہ پسندی کی وجہ سے ممکن ہے بعض لوگوں کو ان سے شکایتیں رہی ہوں، جو اس لئے بیجا تھیں کہ رحم و مروت ہی کی طرح عدل و انصاف کے تقاضے پورا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ان کی وفات کی اطلاع دیتے ہوئے پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی نے یکم اگست کو جو گرامی نامہ مجھے تحریر فرمایا تھا وہ ان کے حالات و سوانح کا مختصر خاکہ ہے، ملاحظہ ہو۔

"پرسوں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے داغ مفارقت دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اللہ بال بال مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے (۱)۔

میرے ان سے ۱۹۴۴ء سے روابط تھے، کلاس میں مجھ سے دو سال پیچھے تھے اور عمر میں ایک سال چھوٹے تھے، اتحاد کے رشتے گوناگوں تھے، مذہبی، علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی اختلاف رائے کی نوبت بہت کم آتی تھی، اس لئے یہ حادثہ ذاتی طور پر میرے لئے بہت شدید ہے۔

زمانہ طالب علمی میں ان کی مالی حالت کمزور تھی اور شادی جلدی ہو گئی تھی یعنی ۱۹۴۶ء میں انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد، جس کی وجہ سے مالی مشکلات میں اضافہ ہو گیا تھا، لیکن شروع سے بہت محنتی اور پابند اوقات آدمی تھے، اس لئے بڑی حد تک مالی مشکلات پر قابو پا لیا تھا، رقم کی فراہمی کے لئے بار بار گھر جاتے تھے اور پرائیویٹ ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے، تاہم امتحان میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے تھے، بہت مرنجاں مرنج اور دھیمے مزاج کے آدمی تھے، اور اس مناسبت سے اس زمانہ میں ہم انہیں "گاندھی جی" کہہ کر پکارتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد الہ آباد چلے گئے تھے، جہاں ڈپلومیسی کے نام سے ایک نیا نصاب رائج ہوا تھا، اس میں ایم۔ اے کیا، لیکن جیسا کہ معلوم ہے بعد میں علمی ذوق اسلامیات میں تبدیل ہو گیا، اس مضمون میں میکگل سے دوسرا ایم۔ اے کیا اور ایم۔ اے کی ضرورت کے پیش نظر "دیوبند اسکول اور مطالبہ پاکستان" کے زیر عنوان مقالہ لکھا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

درمیان میں "مدینہ" بجنور اور "پیسہ" نئی دہلی کے نہایت کامیاب مدیر رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہو جانے کے بعد جامعہ، اسلام اور عصر جدید اور اسلام اینڈ ماڈرن ایج کی ادارت بہت قابلیت سے انجام دی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ان کی وابستگی بہت متنوع تھی، جامعہ کالج کے پرنسپل، بشریات کی فیکلٹی کے ڈین، اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر اور جامعہ ملیہ کے قائم مقام وائس چانسلر۔

ان کے علمی کاموں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پر مختلف نوعیت کے کام کئے، مولانا ابوالکلام آزاد پر متعدد گراں قدر مقالات لکھے، آج کل انگریزی میں ان کی سیاسی سوانح لکھ رہے تھے، جس کی پہلی جلد (جو ۱۹۴۰ء کا احاطہ کرتی ہے) پریس میں ہے، تصوف بھی ان کی دلچسپی کا موضوع تھا اور اس پر بھی لکھتے رہے ہیں۔

دارالمصنفین سے جو شغف تھا اور اس کے کاموں میں جو عملی دلچسپی لیتے تھے اس سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔

غم گین:۔ ریاض الرحمٰن شروانی"

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

(۱) آمین! (معارف)

ادبیات

ایک گمنام عالم[1] کی وفات پر

از جناب قمر اعظمی صاحب۔ کانپور

نکتہ داں رمز آشنا بھی گیا | راست فکری کا سلسلہ بھی گیا
لفظ و معنی بہت پریشاں ہیں | بیچ کا حرف رابطہ بھی گیا
حسنِ تقریر حسنِ شیریں لبی | گفتگوؤں کا ذائقہ بھی گیا
کس کو بھولیں کسے ہم یاد کریں | سر سے پا تک ادا ادا بھی گیا
خشک ٹہنی میں اک ہرا پتہ | معجزہ تھا تو معجزہ بھی گیا
ہار ٹوٹا ہے موتی بکھرے ہیں | ہار کا درِّ بے بہا بھی گیا
فہم وادراک ہم میں تھا ہی کہاں | اب تو لگتا ہے حافظہ بھی گیا
زہر پینا ہے کس طرح پی لیں | زہر پینے کا حوصلہ بھی گیا
اے خرابہ نہ روئیہ کیا کم ہے | تجھ کو جیسے بنا سجا بھی گیا
گرد اصلاح[2] سب سے پوچھے ہے | کیا یہ سچ ہے کہ آئینہ بھی گیا
اے صبا بال اب سنوار بھی لے | ٹھیک ہے محرم صبا بھی گیا
باب حکمت، رنج، ہے تشنہ ابھی | قطرہ قطرہ وہ خوں پلا بھی گیا
فکر[3] سچا ہے تو یقین بھی ہے | سب گئے ہیں تو کیا خدا بھی گیا
اے قمر تو قمر رہے گا قمر | بدر کامل تھا جو چلا بھی گیا

[1] مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم [2] مدرسۃ الاصلاح سرائمیر [3] فکر فراہی۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ علوم اسلامیہ (علوم القرآن والحدیث) جلد اول

از جناب فواد محمد سزگین، مترجم جناب شیخ نذیر حسین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت خوبصورت جلد، صفحات ۴۴۵، قیمت ۳۲۵ روپے، پتہ: کوآپرا بک شاپ اینڈ آرٹ گیلری، ۷۔ شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔ پاکستان۔

علوم وفنون اسلامی کی تدوین وترتیب، تاریخ وتذکرہ نویسی کے دور اول سے ہی شروع ہوئی، تیسری صدی ہجری سے اس فن سے خاص اعتنا وشغف کے ثمرات مرتب ہونے لگے اور آٹھویں صدی ہجری میں اس موضوع پر دائرۃ المعارف کے طرز کی کتابیں لکھی جانے لگیں، دور جدید میں جن مستشرقین نے اس فن سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا ان میں جرمنی کے مشہور مستشرق بروکلمان نمایاں ہیں، انکی کتاب تاریخ ادبیات عربی محتاج تعارف نہیں، اہل علم وتحقیق میں یہ متداول ہے، تاہم مرور زمانہ کے باعث اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی، اس فریضہ کو ترکی کے مشہور عالم ومحقق فواد سزگین نے بیس سال کی سخت محنت کے بعد انجام دیا اور نہایت مفید اضافوں اور حواشی وتعلیقات سے مزین کرکے تاریخ التراث العربی کے نام سے مرتب کیا، یہ پہلے جرمن زبان میں آٹھ جلدوں میں شایع ہوئی بعد میں سعودی عرب کی جامعہ امام محمد بن سعود نے عربی زبان میں اس کی اشاعت کی ذمہ داری لی اور اب تک اس کی دس جلدیں شایع ہوچکی ہیں،

پہلی جلد علوم قرآن وحدیث پر مشتمل ہے اور یہی ہمارے پیش نظر ہے، علوم القرآن، تفسیر القرآن اور علم الحدیث کے تین ابواب میں یہ منقسم ہے، موخر الذکر باب زیادہ مفصل ہے اور اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ خود فاضل محقق کا یہ محبوب موضوع ہے، ہر باب میں اولاً مقدمہ کے زیر عنوان ان علوم کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور پھر عہد بہ عہد پانچویں صدی ہجری تک کے مفسرین ومحدثین کے سوانح وماثر اور ان کے مآخذ کا مفصل ذکر ہے، عموماً سوانح مختصر لیکن بہت جامع ہیں، آثار علمیہ کے تحت ان کے باقیات کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ سب سے اہم ہے، صحاح ستہ کے مولفین کے حالات قدرتاً تفصیل سے ہیں، خصوصاً امام بخاری کا تذکرہ فاضل مولف کی تحقیق وتلاش ومطالعہ کا بہترین نمونہ ہے جس میں انہوں نے بعض غلط تصورات کی نشاندہی کرکے ان کی تصحیح بھی کی ہے، مثلاً اس تصور کو کہ امام بخاری نے اسناد کو فروغ دیا، مصنف کے خیال میں امام صاحب پہلے محدث ہیں جنھوں نے اسناد کے مقابلہ میں متن کی اہمیت کی جانب توجہ دلائی ہے۔

اسی طرح تفسیر کے باب میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے حقیقی معنوں میں کوئی تفسیر یادگار نہیں چھوڑی، فاضل مرتب قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کی تفسیر تمام کی تمام الطبری میں موجود ہے، اس طرح اس کتاب میں ترکی محقق کے وسیع وعمیق مطالعہ کا عطر آگیا ہے، اور اضافوں کے باعث اس کی اہمیت بھی دوچند ہوگئی ہے، اردو ترجمہ کی خوبی کے لیے فاضل مترجم کا نام ہی کافی ہے، انہوں نے بعض ضروری اضافے بھی کیے ہیں مثلاً مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی بذل المجہود اور مولانا

عبدالرحمٰن مبارکپوری کی تحفۃ الاحوذی کا ذکر رہ گیا تھا ترجمہ میں یہ کمی پوری ہوگئی، البتہ کمپیوٹر کی کتابت میں اغلاط بہت زیادہ ہیں، ان کی تصحیح کی سخت ضرورت ہے، بلاشبہ یہ کتاب اردو کے علمی سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہے، فاضل مترجم اس کے لیے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں، توقع ہے کہ دوسری جلدیں بھی انکے ذریعہ جلد ہی اردو داں طبقہ کے ہاتھوں میں آجائیں گی۔

تذکرۃ القراء از جناب محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۱۶، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: دانش بک ڈپو، ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر (فیض آباد) یوپی ۲۲۴۱۹۰۔

اسلام کی علمی و فنی تاریخ کے صفحات جن علماء و اہل فن کے ذکر اور کارناموں سے روشن ہیں، ان میں فن قرأت و تجوید کے ائمہ و ماہرین بھی ہیں، لائق مولف نے اس احساس کے پیش نظر کہ "اردو میں قرائے کرام کے ساتھ وہ اعتناء نہیں کیا گیا جس کے وہ اصلاً مستحق تھے" اس تذکرہ کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی نوعمری و نوآموزی کے باوجود اس فریضہ کو بڑی محنت و کاوش اور خوش اسلوبی سے انجام دیا اور بعض ائمہ تجوید کا جن میں قرائے سبعہ شامل ہیں مفصل تذکرہ اس طرح پیش کر دیا کہ ان کے حالات و کمالات کے علاوہ ان کے عہد کی علمی تاریخ بھی مرتب ہوگئی، نوجوان مولف نے دارالمصنفین کے کتب خانہ سے استفادہ کے ساتھ یہاں کے ماحول کا اثر بھی خوب قبول کیا ہے، پیش لفظ میں بجا طور پر اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ "انہوں نے زبان و بیان اور اسلوب نگارش میں جدید انداز تحریر کے بجائے علامہ شبلی اور ان کے تلامذہ کے علمی انداز تحریر

کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب رہے ہیں"۔ کتاب کی مقبولیت سے لائق مولف کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی۔

سمرقند و بخاریٰ کی بازیافت از جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۸۳، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ حرا، پوسٹ بکس نمبر ۴۲، ۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷۔

تاریخ اسلام کے اوراق عظمت و سطوت میں علاقہ ماوراء النہر کی داستانوں کے نقوش شاید سب سے زیادہ روشن و رنگین ہیں، علوم اسلامیہ کے ابر کرم نے اس خطہ کو جتنا سرسبز و شاداب کیا اس کی مثال کم ملے گی، بخاریٰ و سمرقند اور شاش و تاشقند کی یہ سرزمین اپنے جلیل القدر مکینوں سے بجا طور پر ہمدوش ثریا بن گئی، مسلمانوں کے زوال کے نتیجہ میں یہ علاقہ روس کے کمیونسٹ سامراجیوں کے پنجۂ اقتدار میں پون صدی تک جکڑے رہنے کے باوجود اپنی مذہبی و تہذیبی بقا و حریت کے لیے تڑپتا رہا اور بالآخر اسے رہائی ملی اور اب وہاں عظمت رفتہ کی بازیافت کا عمل شروع ہوگیا ہے، اس سلسلہ میں امام بخاری کی یاد میں مسجد و درس گاہ کی تعمیر نو کا آغاز بھی ہوا، اس کی افتتاحی تقریب میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی میں ہندوستان کے علماء و فضلا کا ایک وفد بھی شریک ہوا، مولانا سید محمد رابع ندوی بھی مولانا مدظلہ کے ہمرکاب تھے، تاریخ و ادب و جغرافیہ کے مزاج شناس اور جذبۂ اسلامی سے سرشار صاحب دل کی حیثیت سے مولانا نے اس سرزمین پر نظر کی وہ اپنے مشاہدات کو سپرد قلم کر کے زیر نظر سفرنامہ کی شکل دی، اس طرح یہ روداد سفر اس علاقہ کے معاشرہ، تہذیب، زبان، رسم

رواج کے [illegible]لق بے حد جامع اور معلومات افزا دستاویز بن گئی، اس خطہ کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ صورت حال سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید و ضروری ہے۔

میرا مطالعہ

از جناب تابش مہدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت صفحات ۲۷۹، قیمت ۵۲ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی نمبر ۶۔

کتابوں کے انتخاب و مطالعہ میں ذوق و مزاج کا فرق ظاہر ہے، خصوصاً اہل علم و دانش کے مطالعہ و وجہ انتخاب و استفادہ کا تجزیہ بجائے خود دلچسپ اور مطالعہ کی چیز ہے، اس مقصد سے لائق مرتب نے مختلف طبقات و مکاتب فکر کے کچھ اہم افراد سے رابطہ قائم کیا اور انکے تاثرات کو حاصل کرکے سلیقہ سے اس کتاب میں پیش کر دیا، قریب چالیس اہل دانش و بینش کی اس فہرست میں تنوع و اختلاف کے باوجود ایک قدر مشترک ہے اور وہ ان سب کا تعمیری، افادی اور اصلاحی ادب سے تعلق ہے، بعض اکابر نے عرصہ ہوا اس موضوع پر اظہار خیال کیا تھا، قند مکرر کے عنوان کے تحت ایسی تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے، بعض حضرات سے براہ راست گفتگو کے ذریعہ معلومات حاصل کیے گیے، اس قسم کی بعض مفید کتابیں پہلے بھی شایع ہو چکی ہیں، یہ مفید اور لائق مطالعہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، توقع ہے کہ مرتب اس سلسلہ کو اور آگے بڑھائیں گے۔

سنت یودھا راجہ مہندر پرتاب (ھندی)

از جناب جیوتی سروپ تنگ، صفحات ۳۲، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: کرم یوگی پرکاشن، بدرقہ، اعظم گڈھ۔ یوپی۔

تحریک آزادی کے ایک نامور رہنما راجہ مہندر پرتاپ کے بعض حالات ان کے عقیدت کیش سکریٹری کے قلم سے۔ (ع۔ص)

دارالمصنفین کی اہم ادبی کتابیں

شعرالعجم حصہ اول: (علامہ شبلی نعمانی) فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا [illegible] بعد ترقی اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور عباس مروزی سے نظامی تک کے تمام شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت۔ ۱۳۰ روپے

شعرالعجم حصہ دوم: شعرائے متوسطین خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت۔ ۱۳۵ روپے

شعرالعجم حصہ سوم: شعرائے متاخرین فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت۔ ۱۲۵ روپے

شعرالعجم حصہ چہارم: ایران کی آب و ہوا، تمدن اور دیگر اسباب کے شاعری پر اثرات و تغیرات دکھانے کے علاوہ تمام انواع شاعری میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت۔ ۱۳۵ روپے

شعرالعجم حصہ پنجم: قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت۔ ۱۳۰ روپے

انتخابات شبلی: شعرالعجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر، شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۱۰۵ روپے

کلیات شبلی (اردو): مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی قصائد اور تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ قیمت۔ ۱۲۵ روپے

گل رعنا: (مولانا عبدالحیٔ مرحوم) اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد اردو شعرا (ولی سے حالی و اکبر تک) کا حال اور آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ۔ قیمت۔ ۶۰ روپے

نقوش سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمات، خطبات اور ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں اردو کے مولد کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۶۰ روپے

شعرالہند حصہ اول: (مولانا عبدالسلام ندوی) قدما کے دور سے جدید دور تک اردو شاعری کے تاریخی تغیر و انقلاب کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ

شعرالہند حصہ دوم: (مولانا عبدالسلام ندوی) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید۔ قیمت۔ ۵۰ روپے

اقبال کامل: (مولانا عبدالسلام ندوی) ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح حیات، فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ان کی اردو و فارسی شاعری کی ادبی خوبیاں اور ان کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بیخودی نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق کی تشریح۔ قیمت۔ ۱۳۰ روپے

اردو غزل: (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اردو غزل کی خصوصیات و محاسن اور ابتدا سے موجودہ دور تک کے معروف غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب۔ قیمت۔ ۷۵ روپے